# مجلۂ عثمانیہ

طلبۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیرین

سید محمد مرتضی　　رضا حسین خان رشید

مطبوعہ حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

# مجلس انتظامی

سال تعلیمی سنہ ۱۳۴۰-۱۳۴۱ف

## صدر

مولوی محمد عبدالرحمٰن خان صاحب صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ

## مشیر حصہ اردو

مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر اردو

## مشیر حصہ انگریزی

مسٹر ای - ای - اسپیٹ پروفیسر انگریزی

## خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمٰن صاحب پروفیسر طبیعیات

## اراکین

آغا جعفر حسن صاحب صدر انجمن اتحاد

سید محمد مرتضیٰ صاحب } مدیرین حصۂ اردو

رضا حسین خان صاحب رشید } مدیرین حصۂ اردو

بی - این - چوبے صاحب مدیر حصہ انگریزی

احمد عبدالحیٰ صاحب منتظم اعزازی

# مجلّہ عثمانیہ

طلبۂ کلیۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ


مدیرین

سید محمد مرتضی

رضا حسین خان رشید



مطبوعہ حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

# مجلۂ عثمانیہ

جلد پنجم شمارہ ۳، ۴ بابتہ سنہ ۱۳۴۰ـ۱۳۴۱ف



ملنے کا پتہ :ـ منتظم اعزازی مجلہ عثمانیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

# اطلاع

۱۔ طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کا یہ سہ ماہی علمی رسالہ حسب ذیل مہینوں کے آخری ہفتوں میں شایع ہوا کریگا :— امرداد (جون) آبان (ستمبر) بہمن (ڈسمبر) اردی بہشت (مارچ)۔

۲۔ سال تعلیمی اور مجلہ کا سال ایک ہوگا۔

۳۔ رسالہ انگریزی اور اردو دو حصوں پر مشتمل ہوگا۔ حصہ اردو کے لئے تقریباً ۸ جزو اور حصہ انگریزی کے لئے تقریباً ۴ جزو مختص کئے جائیں گے۔ رسالہ سالانہ حجم کم از کم (۸۰۰) صفحات ہوگا۔

۴۔ مجلس مشاورت اشاعت کے متعلق رد و بدل کی مجاز ہوگی۔

۵۔ مضامین کا انتخاب مجلس ادارت کریگی۔

۶۔ تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔ خریداری اور دیگر امور کے لئے اعزازی منتظم مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔

۷۔ چندہ کی تمام رقمیں اعزازی خازن مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کیجائیں۔

## چندہ

| | |
|---|---|
| ۱۔ سرکار آصفیہ و برطانیہ سے | بارہ روپیہ سالانہ پیشگی |
| ۲۔ ارباب جامعہ، اصحاب اقتدار اور اداروں سے | آٹھ " " |
| ۳۔ عام خریداروں سے | چھے " " |
| ۴۔ طلباء قدیم، رفاہیہ انجمنوں اور مطالعہ خانوں سے | پانچ " " |
| ۵۔ طلبہ کلیہ جامعہ عثمانیہ سے | چار " " |
| ۶۔ ممالک بیرون ہند سے | ۱۵ شلنگ " " |
| ۷۔ بلاد یورپ کے طلباء قدیم سے | ۱۰ " " |
| ۸۔ فی رسالہ | دو روپیہ " |

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہوں گے اور بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی۔

(۱) بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ (۸) آنے کلدار، (۱۳) آنے سکہ عثمانیہ (۲) بذریعہ سرٹیفکٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات (۱۴) آنے کلدار، (٦) آنے سکہ عثمانیہ (۳) بذریعہ بک پوسٹ، (۹) آنے کلدار، (٦) آنے سکہ عثمانیہ

# مجلۂ عثمانیہ

## فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

### جلد پنجم شمارہ ۳، ۴

# علم اصول قانون کے طریق کار

از

جناب مولوی فاضل میر سیادت علی خانصاحب ایم ۔ اے۔ ایل ۔ ایل ۔ بی ( عثمانیه )
بی ۔ سی ۔ ال ڈی فل ( اکسفورڈ ) بیرسٹر اٹ لا۔ ریڈر یونیورسٹی قانون

چند مواخذ۔ کرکوناف تیهوری آف لا۔ براہس لکچرس۔ ها لینڈ جور سپروڈنس۔ وغیرہ

تمام عمرانی علوم کی خصوصیت ان کا اپنا طریق کار ( Method ) هوتا هے۔ همیں بهی سونچنا چاهئے که علم اصول قانون کا کیا طریق کار هے؟ اگر اسکے ایك سے زیادہ طریق کار هیں تو ان مین کونسا صحیح هے۔ چونکه قانون پر همیشه عمل هوتا رهتا هے۔ اس کے علم کے طریق کار کی صحت کا معیار ایك ایسے نظم قانون کا پیدا کرنا هوگا جو باهم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق هو۔

جب هم انگلستان ، یورپ اور امریکه کے مختلف اساتذہ کی تصانیف پر غور کرتے هین تو ان مین چار طریق کار کو رائج پاتے هین۔ اور وہ یهه هین:—

(۱) مابعد الطبیعاتی یا حضوری طریقه

(۲) تحلیلی طریقه

(۳) تاریخی طریقه

(۴) متقابله طریقه

---

The methods of legal science

## ۔مابعدالطبیعاتی یا حضوری طریقہ

یہہ اکثر جرمن ، فرنچ اوراطالوی مصنفوں کا طریقہ ھے۔ اسکا قدم اول حق اور قانون کے مجرد تصورات کی تحقیق اور انکا اخلاقیات قانون قدرت۔آزادی اور ارادۂ انسانی سے تعلق کی تشریح ہوتا ھے۔اس طرح پر اس میں پہلے مابعدالطبیعاتی نفسیاتی اور اخلاقیاتی بحثیں آجاتی ھیں۔بعد از ان اس میں چند بنیادی قانونی تصورات مثلاً اقتدار اعلی۔اطاعت ذمہ داری فرض اور حق سے بحث ہوتی ھے۔خصوصاً حق کے تصور کی اس طریق کار مین خوب تدقیق ہوتی ھے۔پھر چند عالمی قانونی اداروں مثلاً خاندان۔جائداد۔وراثت۔ازدواج اور معاھدے سے بحث کی جاتی ھے اور پھر ان کے متعلق وہ اصول بتائے جاتے ھین جو فطرتاً ان ادارون کی صحت مزاجی کیلئے مناسب ہوں۔

اس طریق کار کے بعض مصنفین تو محض مجردات ھی میں رہتے ھیں۔اور ان کی تصانیف ان کے بنیادی مفروضہ تصورات پر کلیتہً بنی اور انہین سے مستخرج ہوتے ھیں۔اور باقی مجردات کو چھوڑ کر بہت جلد واقعی قانون تك اتر آتے ھین اور اسکے اصولوں سے بحث کرنے لگتے ھیں۔جب اس طریق کار کے پابند کانٹ اور ھیگل جیسی قابل شخصتیں ہوں تو ان کی تصانیف کو گھٹانا بےادبی ہوگی۔لیکن بلاشبہ ان کی کتابیں بہت ادق ھین۔ان کے مطالعہ سے بہت کم قانونی نقطہ نظر سے مفید باتین معلوم ہوتی ہین۔اور یہہ تعداد میں اتنی زائد ھیں کہ انسان کی کم عمر بھی ان کے پڑھنے مین حائل ھے۔الحاصل یہہ قانون اور قانونی اصولون سے دور محض مجردات کے کھیتون میں بڑی تعداد میں بڑے تناور پودے ھیں لیکن ان کے پھل بہت کم ھین۔اورجیسا کہ آپ نے پالیا ہوگا ان کا طریق کار بھی سائنٹیفك نہین کیونکہ سائنٹیفك طریقہ تو استقرائی یا حصولی ھے۔جو قانونی حقیقتون کو مدنظر رکھتے

ہوئے اصولوں کا استنباط کرتا ہے اور ان کا طریقہ استخراجی۔ قیاس یا حضوری ہے۔ جو مجردات سے نکل کر مجردات ہی میں گم ہو جاتا ہے یا اگر قانونی حقیقتوں تک آتا بھی ہے تو ناکافی حد تک۔ ان تمام عیوب کے گنوانے کے بعد ان کے ایک ہنر کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئیے اور وہ انکی قوت یا نعمت تفکر ہے ( Gift of Speculation ) اگر کوئی ایسا استاد پیدا ہو جائے جسمین ان اساتذہ کی سی خداداد قوت تفکر ہو اور وہ مجردات کو سلام کر کے قانونی حقیقتوں پر حاوی ہو کر اپنی خداداد قوت تفکر سے کام لے تو پھر علم اصول قانون مین ایک اہم اضافہ ہو گا۔

**۳۔ تحلیلی طریقہ** | انگریزی طریقہ مابعد الطبیعیاتی طریقہ کا بالکل ضد ہے۔ اس کے اساتذہ مابعد الطبیعات اور اخلاقیات کو دور ہی سے سلام کر کے واقعی۔ حقیقی اور موجودہ انسانی وضع کردہ قانون سے ابتدا کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ اس طریقہ کے نام سے ظاہر ہے اس کے اساتذہ قانونی انفاظ یا حدود ( Terms ) کو لیتے ہیں ان کی تعریف کر کے ان کے صحیح معنی مشخص کرتے ہین۔ اور ان کے باہمی تعلقات بتاتے ہیں۔ خصوصاً قانون کی تعریف جو ان اساتذہ کی ہے مشہور اور معرکہ الارا ہے۔ جب اس طرح پر قانونی تصورات کے صحیح معنی ذہن نشین ہو جاتے ہیں تو وہ پھر قانون کے عام اصول استقراری طریقہ پر مستنبط کرتے ہیں۔ اور قانون کے کل اصولوں کو ایک نظام میں مرتب کرتے ہیں۔

اس طریق کار کے سب سے بڑے استاد جرمی نبتھم گذرے ہیں انہوں نے انگریزی قانون کی بڑی خدمت اس کی لغویات خرافات اور تصنیفات کو بیرحمانہ تنقید کے ذریعہ ظاہر کرنے سے اور اسکے موجودہ ضرورتوں کے لئے ناکافی ہونے کو ثابت کرنے سے کی۔ ان کی عمر اصلاح کے مد نظر بیرحمانہ نکتہ چینی مین

گذری - جسکا اثر یه ھوا کہ صدیوں کا جمود ٹوٹ گیا : انگریزی قانون اب بے مثال نہیں سمجھا جانے لگا۔ بلاکسٹن کی کنٹریس (شرحین) جسکی انہوں نے اچھی طرح خبر لی اب انگریزی قانون کی صحیح تصویر نہیں سمجھی جانے لگیں اور قانونی نظریوں پر بحث کا میلان عام ھو گیا ھے - جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ ان کی وفات سے تیس سال کے اندر انگریزی قانون مین بہت سی اصلاحیں ھو کر اسکی موجودہ شکل کی ابتدا ھوئی - نتھم کی وفات کے بعد ان کے سب سے مشہور شاگرد جان آسٹن نے اسی طریق کار پر عمل کیا - اور انگریزی قانونی الفاظ کے معنی مشخص کرنے مین بڑی دقت اٹھائی - لیکن شاید انگریزی قانون کی اس وقت بہت کچھ اصلاح طلب ھونیکی وجہ سے ہی ان اساتذہ نے ایک طرف تو تاریخ یعنی ماضی سے سخت بے اعتنائی کی - اور ظاھر ھے کہ علم اصول قانون کے بنیادی اصول بغیر تاریخ کی مدد کے سمجھنا دشوار ھے - لیکن نھتم نے اپنی ساری عمر نہ جانتے ھوئے یہ غلطی کی - اور دوسری طرف دیگر نظامات قانونی سے کوئی قابل لحاظ مدد نہ لی - یہ سچ ھے کہ جان آسٹن نے بہت کچھ رومن لا کو پیش نظر رکھا ھے - جہاں جہاں اسکی دانست میں انگریزی قانون میں کمی پائی گئی ھے اسکو رومن لا سے پورا کرنے کی کوشش کی ھے - لیکن افسوس کہ وہ رومن لا پر اچھی طرح حاوی نہین تھے - اور انہوں نے اسکے متعلق بعض قانونی نظریوں کی دشواریوں تك نظر نہ پہنچنے کی وجہ سخت غلطیاں کی ھین - اسی لئے ان کے بہت سے نتائج غلط ھین -

**۳- تاریخی طریقہ** - اس طریقہ مین بر خلاف مذکورۂ بالا دو طریقوں کے قانون کو بطور ایك معطیہ (Datum) کے نہیں تسلیم کر لیا جاتا ھے - بلکہ اسکے نشو نما پر غور کیا جاتا ھے ، کہ اسکی ابتدا کیسے ھوئی اور موجودہ حالت تك وہ کس طرح پھونچا - اس طریقہ مین قانون وقت کی ایك پیداوار ھے قانون بھی مثل مملکت

کے انسانی فطرت کی اس اقتضا کا نتیجہ ہے کہ انسان مل جل کر ایك معاشرہ (Society) بنا کر رہتے ھیں۔ اور گو اس معاشرہ کے اھم اور بنیادی اصول اور ادارے سارے متمدن ممالك میں ایك ھی ھوں لیکن ھر نظام قانون ھر وقت متغیر الحال ہے، تصورات میں بھی اور تیز اشکال (forms) کی حد تك بھی -

اس طریقے کے فائدے دو ھیں:—اس سے بہت سے قانونی تصورات نظریوں اور قواعد کی تشریح ھوتی ہے، جو تشریح محض تحلیل یا مجرد نظریوں سے نہیں ھوتی۔ کیونکہ یہ تصورات وغیرہ محض عقل انسانی یا فطرت اشیا ھی کے پیدا کردہ نہیں ھوتے ھیں بلکہ ان پر اس ماحول کا بھی اثر ھوتا ہے جہاں ان قوانین کی نشو نما ہوتی ہے۔ ھر قانون ماضی اور حال۔ روایت اور سہولیت کے درمیان ایك میزان ھوتی ہے۔اور محض تحلیل میں چونکہ صرف حال سے بحث ھوتی ہے، کسی بھی نظام قانونی کی پوری تشریح نہیں ھوتی۔ دوسری خوبی اس طریقے کی اس واقعہ کا ثابت کرنا ہے کہ قواعد اور قوانین چاہے آج ھمیں کتنے ھی مفید اور معقول نظر آئیں، اگلی نسلوں کو اتنے ھی مفید اور معقول نظر نہیں آئینگے۔ اسی لئے ماضی کو برا نہیں کہنا چاھئے کیونکہ حال بھی ماضی ھونیوالا ہے۔ اس واقعہ کو اگرچہ یہ قانون کے عام اصول سے نہیں بلکہ تفصیلات سے متعلق ہے قانون سازوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے اس طریقہ میں خطرہ یہ ہے کہ بہت آسانی سے وہ ایك طرف قدامت پرستی میں اور دوسری طرف عام سیاسی اور معاشری تاریخ میں متبدل ھو جاسکتا ہے۔ بعض نقاد اس پر الزام دیتے ھیں کہ یہ ماضی کی پرستش اور اسکو جائز سمجھنے سے اصلاح اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ یہ طریقہ کسی ایك خاص نظام قانون پر بہ نسبت تمام نظامہائے قانون کے زیادہ قابل اطلاق ہے۔ کیونکہ مختلف ممالك کی قانونی تاریخ کی تفصیلیں اتنی بے شمار ھیں کہ ان تمام کے نتائج کسی جامع قانونی نظام میں شامل کرنے غیر معمولی معلومات اور

قوت تعمیر کی ضرورت ہے۔ اور شاید باستثنائے روڈ اف خان اھیرنگ کے کوئی دوسرا شخص اس طریقہ پر عمل کرکے کوئی علم اصول قانون کی کتاب نہیں لکھہ سکا ہے۔

........ آخری اور چوتھا طریقہ۔

**۴۔متقابلہ طریقہ ہے** جو جدید ترین ہے۔ اس کو مکان سے وھی تعلق ہے جو تاریخی طریقہ کو زمان سے۔ اس میں قانونی تصورات۔ تخیلات۔ نظریات اور اداروں کی جو مختلف ممالک اور نظام ھائے قانون پائے جاتے ہیں۔ متقابلہ تحصیل اور تحقیق کی جاتی ہے۔ اور اس طرح سے اس طریق کار کا مقصد ایک ایسے نظام کی تعمیر ہوتا ہے جو فطری ہو کیونکہ مختلف ممالک کے انسانوں میں مشترک ہوتا ہے۔ فلسفیانہ ہو کیونکہ مختلف اقوام ھائے قوانین کا مغز لیا جاتا ہے۔ اور کارآمد ہو کر کیونکہ اس سے یہ ظاھر ہوتا ہے کہ کن ذرایعۂ سے ایک ھی مقصد مختلف نظام ھائے قوانین میں حاصل کیا گیا ہے۔ اور ان میں سے کونسا طریقہ بہترین ہے۔ متقابلہ علم اصول قانون کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس میں تاریخ کی مدد لیجاتی ہے، کیونکہ کسی دو مختلف نظام قانون کے درمیانی اختلافات کا مطالعہ کہیں زیادہ مفید ہو جاتا ہے اگر تاریخ سے مدد لیکر یہ کہا جائے کہ ان اختلافات کی ابتدا کیسے ہوئی۔ اس طرح پر متقابلہ علم اصول قانون کی اس قسم میں معاشری اور سیاسی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے اور اسی لئے اس قسم کو تاریخی طریقہ کی ایک توسیع شدہ شکل سمجھا جاتا ہے۔ دوسری قسم میں گو مختلف نظام قانون کے درمیانی اختلافات سمجھنے تاریخ سے بھی مدد لیجاتی ہے۔ لیکن چونکہ توجہ زیادہ تر حال کے قانونی مسائل پر ہوتی ہے اس لئے دور تک تاریخی میدان میں مسافت طے نہیں کیجاتی ہے۔ اس طریقہ کی اس قسم میں ابتدا مختلف ممالک کے موجودہ قوانین سے کیجاتی ہے اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ ایک ھی قسم کے مسائل کو ان

مختلف قوانین میں کس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی ھے۔ مثلاً آج کل قانون ٹارٹس میں ایك شکل اور متنازعہ فی مسئلہ مالك کی نوکر کے افعال کیلئے ذمہ داری کا ھے۔ اس کے متعلق اس طریقہ میں مختلف ممالك مثلاً فرانس۔ جرمنی ۔ انگلستان۔ ممالك متحدہ امریکہ اور برطانوی نوآبادیوں کے قوانین کا مطالعہ کیاجاتا ھے پھر یہ طے کرنیکی کوشش کی جاتی ھے کہ اس مسئلہ کی مشکلات کو حل کرنیکا کونسا طریقہ آسان ترین اور عملاً بہترین ھے۔

متقابلہ علم اصول قانون کی طرف آجکل عام رجحان ھے۔ دو سال پہلے کیمبرج کے پروفیسر ونفیلڈ نے ایك بسیط خطبہ اسکی ضرورت اور فائدوں پر دیکر اس کی تحصیل کی ترغیب دی ھے اور افسوس ظاھر کیا ھے کہ مین کے بعد سے کسی نے قابل لحاظ طور پر اس پر توجہ نہیں کی ھے۔ اصولاً علم اصول قانون کے اس طریقہ پر اعتراض کرنا مشکل نظر آتا ھے، سوائے اس کے کہ باوجود اصولاً اسکے ٹھیك ھونے کے اس پر کام اتنا کم ھوا ھے کہ ھم کچھ نہیں سکتے کہ عمل میں اسکی کیا حالت رھیگی؟ مین نے بیشك قابل قدر کام کیا ھے لیکن ھم ادب سے کہنا چاھتے ھیں کہ انہوں نے تاریخ پر اتنی زیادہ توجہ کی ھے کہ ان کے کام کو قانون کا تاریخی مطالعہ کہہ سکتے ھیں۔ اور اسی لئے علم اصول قانون کی عملی ضرورتوں کیلئے کم مفید۔

آخر میں یہ سوال کرنے سے پہلے کہ ھمیں ایك علم اصول قانون کیلئے ان چار طریقوں میں سے کس طریقہ کو اختیار کرنا چاھئے ھمیں یہ بھی پوچھنا چاھئے کہ آخر علم اصول قانون کس کیلئے مفید ھوگا اور کس کیلئے اسکو بنانا چاھئے۔ اس علم سے فائدہ یا تو قانون سازوں کو ھوسکتا ھے یا وکلاء اور ججوں کو یا طلبا کو۔دنیا کے متمدن ممالك کے مقننہ جات میں آجکل بہت کم قانون داں اشخاص ھوتے ھیں۔ اسلئے زیادہ تر ھمارا روئےسخن

وکلا۔ ججوں اور طلبا کی طرف ہوگا۔ کہ قانون کے اصول پر مکمل طور پر جاری ہونے ان کو صحت۔ روشن دماغی۔ ہوشیاری ذہانت اور سرعت سے استعمال کرنے میں علم اصول قانون کہاں تک مفید ہوسکتا ہے ؟

اس مطلب کیلئے۔ چاروں طریق کار مفید ہیں۔ لیکن نسبتاً شاید تاریخی طریقہ سب سے بہتر ہے۔ کیونکہ ما بعد الطبعیاتی طریقہ کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی خوبی قوت تفکر ہے لیکن اس کا نقص یہ ہے کہ اسکی کتابیں بہت ادق ہیں۔ اور وہ مجردات ہی میں بہت زیادہ گم ہے۔ تحلیلی طریقہ سے ہمارے قانونی تصورات اور خیالات متعین اور مشخص ہوتے ہیں۔لیکن تاریخ سے بے اعتنائی کی وجہ سے اس میں وسیع النظری نہیں۔ استقرا کیلئے بہت سے مواد سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اسی لئے اس کے بعض اساتذہ کے بعض نتائج غلط ہوتے ہیں۔ متقابلہ طریقہ اصولاً ٹھیک ہے لیکن ابھی اسکو عمل کی کسوٹی پر اترنا ہے۔ تاریخی طریقہ سے قانونی تصورات اچھی طرح سمجھ میں آتے ہیں۔ استقراء کیلئے اگر احتیاط کیجائے تو حسب ضرورت مواد مل جاتا ہے۔ اور نتائج غلط ہونیکا احتمال نہیں رہتا ہے۔

لہذا اگر اب ہم سے سوال کیا جائے کہ قانون کی تعلیم اور قانونی ذہنیت کے پیدا کرنیکے لئے ان چار طریقوں کو کس طرح استعمال کیا جائے؟ تو کیا اسکا جواب حسب ذیل نہیں ؟ کہ ہمیں ابتدا اس تحقیق سے کرنی چاہئے کہ قانون کی عمرانی علوم میں جگہ کہاں ہے ۔ باالفاظ دیگر ہمیں قانون کا تعلق اخلاقیات۔ نفسیات۔ سیاسیات اور معاشیات سے دریافت کرنا چاہئے چونکہ یہ تحقیق فطرت انسان اور اسکے عام تصورات پر مبنی ہوگی اسی لئے مابعد الطبعیاتی طریقہ کے تحت آئیگی۔ اس کے بعد ان تصورات کی تحقیق چاہئے جو تمام نظامہائے قانون میں بنیادی ہیں یعنی حق۔ فرض۔ وجوب، ذمہ داری، قانون اور

رواج ۔ بعض اساتذہ ان تصورات کو مابعد الطبعیاتی یا حضوری طریقہ پر فطرت انسان سے مستخرج کرنا پسند کرینگے ۔ اور بعض ان تصورات کو موجودہ اور مروج معنوں سے ابتدا کرکے تحلیل کے ذریعہ ان کے معنوں کو معین اور مشخص کردینا ۔ ان تصورات کی تحقیق میں چاھے ان دونوں میں سے کوئی بھی طریقہ استعمال کیا جائے اور دراصل ان دونوں میں حقیقی فرق کم ھے (کیونکہ اگر ایك فطرت انسان کی حضوری معنوں سے ابتداکرتا ھے تو دوسرا اسکے مظاھر سے) لیکن دونوں طریقوں میں تاریخی طریقہ کار کی مدد ضروری ھوگی ۔ کیونکہ ھمارا مقصد قانون کے عام اصولوں کا مدون کرنا ھے ۔ ان کی تدوین میں تاریخ سے بےاعتنائی نہیں ھوسکتی ۔ اور اسکی مدد ضروری ھوتی ھے تاکہ ھم ان اصولوں کے ضروری اور مستقل عناصر میں سے کسی کو فروگذاشت نہ کردیں اور ھماری تعریفیں ان عام اصولونکے ضروری عناصر پر مشتمل ھوں ۔ مثلاً کچھہ عرصہ قبل قانون کی جو مشہور ترین تعریف تھی اسکو لیجئیے ۔ اسکی رو سے قانون حکم مملکت (Command of the State) ھوتا ھے ۔ لیکن جیسا کہ میں نے ثابت کر دکھایا ھے یہ تعریف ھر سیاسی معاشرہ یا مملکت پر صحیح نہیں آترتی ۔ پس اس واقعہ سے کہ وہ سیاسی ترقی کے بعض مدارج پر اطلاق نہیں پاسکتی ظاھر ھے کہ وہ کافی عام اساس پر مبنی نہیں ھے ان عام تصورات کی تحقیق کے بعد ھم ایك دوسرے مجموعہ تصورات کی جو خالصاً قانونی ھیں تحقیق کرینگے ۔ مثلاً ذیل کے تصورات کی ۔ یعنی ملکیت ۔ قبضہ ۔ معاھدہ ۔ ٹارٹس، فعل خلاف قانون ۔ ازدواج ۔ ولایت ۔ غلامی ۔ انتقال جائداد ۔ رھن حقوق آسائش ۔ بیع ۔ شراکت ۔ تحویل اماتی ۔ جرم ۔ فریب اور غفلت کی اس وقت ھم موجودہ نظام ھائے قوانین کے قواعد سے اور زیادہ قریب ھوجاوینگے ۔ گو ایك جرمن مابعد الطبعیاتی ان تصورات کو مثلاً ملکیت اور معاھدہ کے تصور کو ان عام حضوری اصولوں سے مستنبط کریگا جنکو وہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں اصول موصوفہ کے طور پر قرار

دیگا۔ اور ایک سقراطی یا بتہمی تحلیلی طریقہ کا استاد ان تصورات کے معنوں کی تحلیل اور تجزیہ سے ان کی تعریفات وضع کریگا۔ لیکن ضرور ہے کہ ان تصورات کی تحقیق اور ان کی تعریف ان معنی کے مطالعہ پر مبنی ہوں جو ایک یا زاید نظام قانون میں ان تصورات کے ہیں۔ یہاں تاریخی طریقہ سے پھر بڑی مدد ملیگی۔ کیونکہ کسی بھی نظام قانون کے وہ قواعد جو انسانوں کے ان تعلقات کو منضبط کرتے ہیں جو ان کے معنے سے نکلتے ہیں، کچھ نہ کچھ حد تک بے ضابطہ اور ایک نہ ایک حد تک ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، جو محض عقل کے پیدا کردہ یا محض عقل پر مبنی نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ تاریخی اسباب اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً قبضہ۔ وراثت اور رہن کے رومی اور انگریزی قواعد میں بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جن کی توضیح محض تاریخی مطالعہ ہی سے ہوسکتی ہے۔ ہم عام اصول بناتے وقت ایسی خصوصیات کو نظر انداز کردینگے۔ لیکن ہم کو یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی ابتدا کیونکر ہوئی ورنہ ان تصورات کے بعض اہم پہلو سے ہم غافل رہینگے۔ اور ہماری تعریفوں میں وہ ضروری اور مستقل عناصر نہیں ہونگے جو ایک عام علم اصول قانون کیلئے ضروری ہیں۔ اس طرح پر ایک عام علم اصول قانون کی تدوین میں گو تاریخ کا درجہ ثانوی ہے لیکن بہت ضروری بھی ہے کیونکہ تاریخی مطالعہ ہی سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ اشیا یا تصورات جن کے نام مختلف ہیں دراصل حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ اور اشیا یا تصورات جن کے نام ایک ہی ہیں دراصل حقیقت میں جدا ہیں۔ اس طرح پر علم اصول قانون کے استاد کو تاریخ سے قانونی تصورات کی وہ کامل توضیح اور تشریح ملتی ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں۔ متقابلہ طریقہ سے بھی آسے اسی قسم کی مدد ملتی ہے کہ بہت زیادہ زور کسی نظریہ یا ادارہ کی اس خاص شکل پر جو وہ کسی ایک نظام قانون میں اختیار کیا ہے نہیں دینا چاہئے بلکہ مغز کو دیکھنا اور مختلف پردوں میں جو ایک ہی تصور کارفرما ہے اس کو

گرفت کرنا چاهئے۔

مذکورۂ بالا تمام تصورات علم اصول قانون کے موضوع هیں۔ کیونکه یه هر ترقی یافته نظام قانون میں پائےجاتےهیں اور قانون کے مفاد پر مستقله هیں۔ لیکن اگر هم آگے اور تفصیلات میں جائیں تو عام اصولوں کو مستنبط کرنا زیادہ مشکل هوجاتا هے۔ کیونکه تفصیلات میں هر قوم کے خاص طریقوں اور رواجات کوبهی دخل هوتا هے اور یہاں جو طریقه یا رسم ایك قوم کے لئے مناسب هوتا هے دوسرے کیلئے مناسب نہیں هوتا، تو ہم ان علم اصول قانون طالب علم کو الوداع کہیگا ، اور اسکو ان اساتذہ کے سپرد کردیگا ، جو مثلا انگلستان ، اسکاٹلینڈ ، فرانس یا روس کاقانون پڑهاتےهیں۔ اور رخصتانه نصیحت یه کریگا که ان قوانین کی تفصیلات میں اور ان پر تنقید کرتےوقت آن عام اصولوں کو اطلاق دے جو علم اصول قانون میں اس نے سیکھے هیں۔

اس طرح علم اصول قانون کے اصول موضوعه کچهه بہت زیادہ نہیں هیں اور ایك مختصر سے پیمانه میں بیان کردئے جاسکتے هیں۔ سوائے اسکے که اساتذہ ایك طرف اخلاقیات میں اور دوسری طرف تاریخی مواد میں بہت زیادہ دور تك جائیں اور اس علم کے مطالعه کا فائدہ ان معلومات کے بہم پہچانےپر جواس علم کے مطالعه سے حاصل هوتےهیں موقوف نہیں هے۔ بلکه اس تربیت دینے پر که تفصیلات پر همیشه صحیح اصولوں کا اطلاق دیا جاسکے ۔ اسی لئے هر طالب علم کو تفصیلات میں پڑهنے سے پہلے اصولوں پر حاوی اور ان کے صحت روشن دماغی ذهانت اور سرعت سے اطلاق دینے میں ملکه حاصل کرنا چاهئے۔ اور نه اس کو اور نه جج اور وکلا کو کبهی فراموش کرنا چاهئے که قانون کی ترقی میں وہ قابل قدر مدد دیسکتے هیں پس اس طرح پر اگر مذکورۂ بالا امور کو ملحوظ رکهیں تو عام علم اصول قانون کے اصولوں کی تدوین سے هم ایك ایسا نظام قانون پیدا کرسکتے هیں

جو باھم متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق ھو گا۔

اور اوپر کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ھو گا کہ، علم اصول قانون ایک علم ھے۔ اور وہ عام ھے۔ اس کی تحصیل کیلئے چار طریقے رائج ھیں۔ چاروں مفید ھیں۔ لیکن ھر ایک کی خوبیوں کو لیکر علم قانون کے وہ اصول مرتب ھوسکتے ھیں جن کے مطالعہ سے قانونی ذھنیت پیدا ھوتی ھے اور جو نظام قانون کو متوافق متوازن اور عوام کی ضرورتوں کے موافق کردیتا ھے۔

---

# ماهیت قانون

قانون کیا ہے؟ اس حصہ میں ہمارے سامنے اسی کی تحقیق ہے۔ مختلف اساتذہ کی قانون کی ماہیت کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ چنانچہ قانون کی ماہیت کے متعلق تحلیلی اور تاریخی اسکولس میں معرکتہ الارا اختلاف ہیں۔ اور یوں تو ڈین پونڈ نے قانون کی ماہیت کے متعلق (۱۲) مختلف تصورات گنادئے ہیں۔ لیکن بہ لحاظ شہرت اور اہمیت کے ہم حسب ذیل چار اہم تصورات پر تفصیل سے غور کرینگے۔ چنانچہ قانون کی ماہیت کے متعلق پہلا اور بہت قدیم تصور یہ ہے کہ:—

(۱) قانون ایک مطلق۔ عالمی اور اخلاقی اصول کا مظہر ہے یعنی قانون قدرت (Jus Natural or Law of Nature) ہے۔ یہ تصور بہت ہی قدیم ہے اسکو برک نے بدیں الفاظ بخوبی ادا کیا ہے کہ صحیح معنی میں تمام انسانی وضع کردہ قوانین علانی ہیں یعنی ایک الٰہی قانون کا اعلان کرتے ہیں۔

(۲) قانون ایک مقتدر اعلی کی مرضی یا اسکا مظہر ہے قانون کے اس تصور کو تحکمی تصور (Imperative conception) کہتے ہیں۔ اسکا اب بھی بڑا اثر ہے۔ اور اسکی خوبی بھی کچھ تھوڑی نہیں ہے۔ انگریزی علم اصول قانون کا یہ خصوصی تصور ہے گو ہمیں ماننا پڑیگا کہ یہ یک رخی اور غیر مکمل تصور ہے۔

(۳) تیسرے تصور میں قانون تاریخی قوتوں اور حالات کا پیدا کردہ (قاعدہ عمل) ہے۔ وہ نہ تو شعوری تخلیق ایک فوق البشر عالمی حکمران اصول کی ہے اور نہ مقتدر اعلی کی مرضی کی۔ بلکہ قانون ایک ارتقا ہے ایک نشو نما ہے جو حالات کا پیدا کردہ ہے ایسی حالات کا جو بڑی

حد تك اتفاق هيں اور تقريباً كلية زمان مكان اور قوم كے اختيار سے باهر هيں۔ اور اسى لئے قانون كا يه تصور انيسويں صدى كے تاريخى اسكول كا تصور يا همارے الفاظ ميں اسكى تعبير هے۔ اسكا اثر روز افزوں هے اور اسكى خوبى بهت زياده۔ ليكن يه بهى يك رخى اور غير مكمل هے۔

(۴) چوتهے تصور ميں قانون ايك خاص مقصد كيلئے ايك خاص ذريعه هے يعنى وه ايك آله هے مقصود باالذات نهيں۔ مقصد تو كوئى اخلاقى يا معاشرى هوتا هے مثلاً انصاف آزادى۔ افاديت۔ عوام يا افراد كا مادى مفاد۔ اس تصور كے حامى اساتذه كا دعوى هے كه بغير ان اخلاقى يا معاشرى مقصدوں كو پيش نظر ركهے كه قانون كا سمجهنا دشوار هے۔

# قانون قدرت

مين كى Ancient Law - كارلايل كى Medival Pol. Theories in the west. - برايس كا گيارهواں مقاله - پالك كى Essays on the Law. اور پالك كى The expansion of the common Law آسٹن كا اكتيسواں لكچر - وينوگراڈاف كى Common sense in Law كا آخرى باب - كركوناف - تهيورى آف لا جلد (۱) باب (۳)

قبل اسكے هم قانون كے اس تصور كے ان چار دور كا ذكر كريں جو اس پر گذرى هيں۔ هم يه كهه دينا چاهتے هيں كه آجكل اكثر اساتذه قانون كے اس تصور كو بهت هى شبه سے ديكهتے هيں۔ اساتذه كى سارى توجه قانون صريح ( Positive Law ) يعنے انسانى وضع كرده قانون كى ماهيت سمجهنے اور اسكے مطالعه ميں صرف هوتى هے۔ بهت هى كم اساتذه اس انسانى قانون كو (Idealise) يعنے تمثالى بنا كر اسكا مطالعه كرتے هيں۔

گویا آجکل نقطہ نظر معروضی ہے موضوعی نہیں۔ بہرحال اب ہمیں مختصر طور پر یہ جاننا چاہئیے کہ قانون کے اس تصور پر کہ قانون ایک مطلق، عالمی، اور اخلاقی اصول ہے یعنی اسکا مظہر ہے حسب ذیل چار دور گذرے ہیں۔

الف۔ پہلا فلسفیانہ دور

ب۔ دوسرا قانونی دور

ج۔ تیسرا مذہبی دور

د۔ اور چوتھا جدید دور

## الف۔ پہلا فلسفیانہ دور

جب انسان قدرت کے مختلف مظاہر سے واقف ہو گیا اور ان پر غور کرنے لگا تو پہلے تو اس نے عالم حیوانات اور نباتات اور انکے مختلف اقسام میں دیکھا کہ گونا گوں اختلافات کے باوجود یہاں چند مشابہتیں اور یکسانیتیں پائی جاتی ہیں اور تمام حیوانوں نباتاتوں میں جو سب سے زیادہ مشترک امر ہے وہ ان کے نشوونما کے طریقہ ہیں یعنی تمام حیوان ایک ہی طرح پر پیدا ہوتے ہیں۔ پہلے چھوٹے اور کمزور رہتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ بڑے اور قوی ہوتے ہیں۔ اور اسکے بعد وہ کمزور ہوکر مر جاتے ہیں۔ اسی طرح تمام پودے زمین سے اگتے ہیں۔ کونپلیں اور پھر پتے نکالتے ہیں انہیں پھول لگتے ہیں اور بڑے ہونیکے بعد ان میں بیج پیدا ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی مرجاتے ہیں۔ ان مظاہر کو نوٹ کرنے سے اس کے ذہن میں چند تصور پیدا ہوئے۔ مثلاً یہ کہ یہ مشترک خصوصیات پیدا ئشی ہیں۔ حیات اور ممات نشو ونما (کے قانون سے) کسی کو مفر نہیں ہے۔ اور یہ بھی کہ ان مظاہر سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نیچے کوئی قوت ہے جو ان مخلوقات پر کارفرما ہے۔ ان سے کلیۃً ماسوا

ہے اور ان کے اختیار سے باہر ہے اور اسی نے انکی زندگی کے طریقوں کو مقرر کیا ہے ۔

قدرت کے مظاہرے سے واقف ہونیکے بعد غور کرنے والے انسان کا دوسرا مشاہدہ یہ ہوا کہ انسانوں میں بھی مثل حیوانات و نباتات کے باوجود گونا گوں اختلافات کو بہت سی اہم خصوصیات مشترک ہیں ۔ ان کی خواہشات تمنائیں اور جذبات ایک ہی ہیں ۔ یہی خواہشات اور جذبات باوجود شخصی اختلافات کے تمام انسانوں کے افعال کے محرک ہوتے ہیں اور ایسے اصولوں اور طریقوں پر محرک ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک ہی ہوتے ہیں ۔ اس طرح پر یہ تصور پیدا ہوا کہ باوجود شخصی اختلافات کے تمام انسانوں کی ساخت ایک ہی ہے ۔ یہ ساخت ان کی بنائی ہوئی نہیں ہے ، بلکہ اسکا بیج ان کی فطرت میں مضمر ہے جو جسمانی اور ذہنی ترقی کیساتھ نشو و نما پاتا ہے ۔ اس طرح پر کل انسانوں کی مشترک خصوصیتوں کا اہم تر جز ان کی پیدایش بہ حیثیت انسان اور ان کے نشو نما اور زوال ہوئے ۔ سو یہاں بھی حیات نشو نما اور ممات کے مظاہر ایسے مظاہر ہوئے جو تمام انسانوں سے متعلق ہیں ۔

اور جب انسان غور کرنے سے بھی آگے بڑھکر فلسفہ نے لگا یعنی جب اس میں فلسفی پیدا ہوئے تو انہیں ایک ایسی علت کی تلاش ہوئی جو جاندار اور بے جان عالم کی قوتوں کے پیچھے ہے اور نیز جسکی وجہ سے ایک نظام سا دنیا میں پایا جاتا ہے ۔ کیونکہ دنیا کی طبیعاتی قوتیں ۔ ہوا ۔ بارش ۔ پانی ۔ چاند سورج وغیرہ بھی ایک منتظم قاعدہ کے تحت عمل کرتے ہیں ۔ تو جاندار اشیا بھی مقررہ طریقوں اور اصولوں پر پیدا ہوتے نشو نما پاتے اور فنا ہوجاتے ہیں ۔ اسی لئے فلسفی اس نتیجہ تک پہنچے کہ کارخانہ قدرت میں ایک ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے جس نے اپنی مرضی سے دنیا

میں نظام قائم کیا ھے۔ چاھے یہ قوت ایك خدا ھو۔ یا اشیا ھی میں کوئی فطری اور ان روك طاقت۔ اس قوت کو انھوں نے جو نام دیا وہ پیدایش (Birth) کے مشتقات سے ھے یعنی (Nature) بالفاظ دیگر فطرت یا قدرت۔

اسی طرح جب فلسفی حضرات انسان کے متعلق سوچنے لگے تو پہلے تو انہیں تمام انسانوں میں چند مشترك خصوصیات دریافت ھوئیں۔ اور مزید بر آں انھوں نے دریافت کیا کہ جسطرح تمام حیوانوں کی تمام قوتیں ملکر ان کی جسمانی ترقی اور تحفظ کی طرف کام کرتے ھیں۔ اسی طرح انسانوں کی تمام قابلیتیں۔ ذھنی اور جذباتی قابلیتیں ان کے ایك ذی عقل ارادے کے ماتحت ھیں۔ پس وہ مرکزی اور بالاترین قوت جنھیں انھوں نے مادی دنیا میں فطرت یا قدرت کے نام سے موسوم کیا تھا۔ انسانی دنیا میں اسے انھوں نے (Reason) عقل سمجھا۔ اور جب انسانی دنیا میں اس قوت سے عاقلانہ کام سرزد ھوتے ھیں تو کیا یہ خود لازماً ذوالعقل (Rational) نہیں۔ اس طرح پر فطرت اور عقل مرادف ھوگئے۔ یا فطرت خود عقلمند سمجھی گئی۔ یا کم از کم فطرت میں عقل کا بھی ایك پہلو مانا گیا۔

پس جب فطرت یا قدرت کا تصور انسانی سوسائٹی کے متعلق اطلاق دینے سوچا جانے لگا تو اسکے دو اجزاء پائے گئے۔ یکسانیت اور قوت۔ یکسانیت اس لئے کہ تمام انسانوں کی ایك ھی قسم ھونے کی وجہ سے ھے۔ ان کے جذبات خواھشات مقاصد اور انکا مبدا ایك سے ھوتے ھیں اور قوت اسلئے کہ یہ یکسانیت ایك ذوالعقل طاقت کی وجہ سے ھے اور یہ ذوالعقل طاقت چاھے مادی دنیا میں شعوری ھو یا نہو (اور یہاں فلسفیوں میں اختلاف تھا اور ھے) لیکن یہ انسانی دنیا میں شعوری اور شخصی ھے۔

قوانین قدرت کا لفظ بہت بعد میں وضع ھوا۔ لیکن اسکے یہی دو اجزا تھے۔ یعنے تمام دنیا میں قدرت کے مظاھر میں یکسانیت پائی جاتی ھے۔ اور یہ یکسانیت ایك

ذوالعقل طاقت کی وجہ سے ہے۔ اسی کی وجہ سے مادی دنیا کے طبعیاتی مظاہر میں یکسانیت ہے اور یہ یکساں مظاہر قوانین قدرت ہیں۔ اسی طرح انسانی دنیا میں انسانی امور میں اخلاقی، معاشری، سیاسی اور قانونی امور میں باوجود گوناگوں اختلافات کے یکسانیت ہے اور یہی یکساں امور قانون قدرت ہیں۔

قانونی امور ھی کو لیجئے۔ مختلف قبایل میں کچھ تو انکے ماحول کی وجہ سے مثلاً ملک کے زرعی ہونے یا ریگستانی ہونے یا ساحل سمندر پر ہونے کی وجہ سے قانون کی تفصیلات میں فرق ہوگا اور ایک دیہی آبادی کے قوانین ایک بدویانہ خانہ بدوش شکاری قبیلہ کے یا ایک مچھلی خوار بستی کے آبادی کے قوانین سے تفصیلات میں جدا ہونگے۔ اسی طرح نہ صرف ماحول کے اثر کی وجہ سے بلکہ کسی تاریخی حادثہ کی وجہ سے بھی قوانین کی تفصیلات میں فرق ہوجائیگا۔ مثلاً کسی زبردست قبیلہ سے جنگ میں ہارنے کی وجہ سے زبردست قبیلے میں قوانین کی بہت سی تفصیلات مختلف ہوجائینگی۔ یا کسی زبردست پادشاہ کی بدمزاجیوں اور اوھام کا بھی قوانین کی تفصیلات پر اثر ہوجائیگا۔ لیکن تمام قبایل اور اقوام میں باوجود ماحول۔ تاریخی حادثوں یا شخصی شاھی اوھام کے بہت سے رسم و رواج و قوانین ایک سے ملینگے۔ ہر جگہ ایک ھی قسم کے افعال کو برا سمجھا اور ایک دوسرے قسم کے افعال کو اچھا سمجھا جائیگا۔ مثلاً سرقہ۔ قتل وغیرہ کو برا۔ بہادری شجاعت وغیرہ کو اچھا سمجھا جائیگا۔ ہر جگہ خاندانی تعلقات ہونگے۔ ان کے متعلق اصول باوجود گوناگوں تفصیلی اختلافات کے ایک ھی ہونگے۔ کسی نہ کسی قسم کی عدالتی مشنری ہوگی۔ کوئی نہ کوئی مذھبی پیشوا اور خدا ہونگے۔ یہ مشابہتیں اور یکسانیتیں اتنی یقینی اور عام طور پر پائی جائینگیں کہ اگر کوئی مسافر ایک بالکل ھی نئے قبیلہ میں جاسکے تو ان مظاہر کے وجود کا اس کو یقین کرلینا چاھئے۔ اور کو ترقی یافتہ اقوام اور وحشی اقوام کے قوانین

اور رسم و رواج میں فرق ہوگا۔ لیکن یہ فرق صرف درجہ کا ہوگا۔ اور وحشی اقوام میں بھی انہیں قوانین و رواجات کے تخم پائے جائینگے جو مہذب اقوام میں بار آور پودوں کی شکل میں نظر آتے ہیں۔ غرض ہر مکان اور زمان میں قوانین اور رسم و رواج کا یہ فرق کہ کچھ ان میں فطری عالمی اور مستقل اور کچھ مصنوعی مقامی یا عارضی ہوتے ہیں پایا جائیگا۔ قوانین اور رواجات کا وہ حصہ جو فطری۔ مستقل اور عالمی ہو وہ تمام انسان کی ساخت۔ قسم۔ فطرت کے ایك ہونے کی وجہ سے ہے۔ بالفاظ دیگر فطرت نے انہیں ان قوانین کو سکھایا ہے اور یہی قوانین فطری یا قدرتی ہیں۔

ان فطری یا قدرتی قوانین کی جانب ادب میں جگہ جگہ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سفوکلس کی (Antiyone) میں جب بادشاہ نے آنٹیون پر شہر کے قوانین کی خلاف ورزی کا الزام دیا تو اس بہادر عورت نے جواب دیا کہ ان قوانین کو (Zeus) یا انصاف نے یا عالم علوی کے دوسرے خداؤں نے نہیں بنایا ہے۔ آخرالذکر قوانین ایسے ہیں جو آج یا کل کے نہیں ہیں بلکہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہینگے۔ سقراط کو بھی زہر کا پیالہ یونان کے قوانین کے خلاف ورزی میں انہیں قوانین کی طرف ہدایت کرنے کی وجہ سے پینا پڑا۔ سینٹ پال نے بھی ان قوانین کی تعریف یوں کی کہ یہ وہ قوانین ہیں جو انسانوں کے دلوں پر منقوش ہیں (Heraclitis) نے ان کو الہی قانون کہا جس سے تمام دنیوی قانون کو غذا ملتی ہے۔ سقراط نے کہا یہ قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی خلاف ورزی میں ان کی سزا مضمر ہوتی ہے۔ افلاطون نے مجرد نظری انصاف کو واقعی انصاف کے مخالف بتایا ہے۔ ارسطو نے اس خیال کو اور بھی صراحت کیساتھہ بیان کیا ہے کہ قوانین اور رسم و رواج اگرچہ انصاف پر مبنی ہوتے ہیں۔ لیکن ہر وقت ان کا اصلی انصاف پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ اصلی، یا فطری انصاف بہت سی صورتوں میں قوانین کے واقعی انصاف سے ورے رہتا تھے

یہی قانون قدرت ہے۔ واقعی قوانین کو اسی کی تلاش رہی ہے۔ رواقئین پر ارسطو کی تصنیفات کا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے اسکو عقل ( Reason ) یا الہی عقل کے مرادف سمجھا۔ اور قرار دیا کہ چونکہ یہ عقل فطری ہے اس لئے اگر انسان اسکی تتبع یا فطرت کے موافق زندگی بسر کرے تو اپنے فرض سے سبکدوش ہوکر خوشی حاصل کریگا۔

## (ب) دوسرا قانونی دور

قانون قدرت کا دوسرا قانونی دور رومی دنیا میں رومی تجربہ کی وجہ سے شروع ہوا۔ روما جزیرہ نما اطالیہ میں ایسی جگہ واقع تھا کہ وہاں بہت سے اجنبی تجارت کی خاطر آتے تھے ان اجنبی قبائل کے قوانین اور رسم و رواج رومی قوم کے قوانین وغیرہ سے جدا تھے۔ اور یہہ قانون روما کا ایك اصول تھا کہ اس کے قوانین سے فائدہ اٹھانے رومن شہری ہونا ضروری تھا۔ اور ظاھر تھا کہ یہہ اجنبی رومن شہری نہ تھا۔ اور یہہ بھی ظاھر تھا کہ ان اجنبیوں اور رمن شہریوں کے تجارت وغیرہ کے تعلقات منضبط کرنے کسی قانون کی ضروت تھی۔ اس طرح پر رومن مجسٹریٹوں کو ایك قانون بنانے کی ضرورت ھوئی جو بعد میں چلکر ( Jus gentium ) قانون اجانب کے نام سے مشھور ھوا۔

اس کی ابتدا اور طریق کار کے متعلق مختلف نظریہ ھیں۔ چنانچہ سرھنری میں کا نظریہ ھے کہ ایك خاص رومن پریٹر Pregrinus اجانب کیلئے مقرر کیا گیا اس نے مختلف قبائل کے قوانین کو دیکھا اور ان کا مقابلہ کرکے ان میں سے سب سے بہتر قانون کو منتخب کیا اور اس کو نفاذ دیا۔ لیکن صحیح بات یہہ ھے کہ کوئی ایك رائے قائم کرنا کمی معطیات کی وجہ سے مشکل ھے۔ مین کی رائے اب

زیادہ وقیع نہیں سمجھی جاتی۔ کیونکہ یہہ محض انکا خیال ھے اور معطیات پر مبنی نہیں ھے (اور اسلئے بھی کہ رومن لا میں بہت کم اجنبی عناصر ھیں۔ غالبا یہہ خیال صحیح ھے کہ خود رومن لا کے اصولوں کو انکی ( technicalities ) مصطلحات سے صاف کر کے ترقی دیگئی )۔ برائیس کا خیال ھے کہ غالبا رومن مجسٹریٹوں نے تجار کے ان رواجات کو جس پر مختلف قبائل کے تاجروں کو عمل کرتے دیکھا، لے لیا۔ اسی طرح جس طرح بہت بعد انگریزی ججوں نے لارڈ مانسفیلڈ کی سرکردگی میں انگریزی تجارتی قانون میں تاجروں کے رواجات کو تسلیم کر لیا۔

چاھے طریق کار کچھ بھی ھو لیکن یاد رکھنے کی بات یہہ ھے کہ رومنیوں نے عملی ضرورت کی وجہ سے آھستہ آھستہ قواعد اور ضوابط کا ایك ایسا مجموعہ تیار کیا جو گو عام خصوصیتوں میں ان کے قانون ( jus civile ) سے مشابہ تھا لیکن جو کم اصطلاحی زیادہ عملی اور عام انسانوں کی سمجھ کے موافق تھا۔ اس کو انہوں نے ( jus gentium ) کہا، یعنی ایسا قانون جو مختلف قبائل اور اقوام میں عام ھو، جس کو تمام اقوام استعمال کرتے اور سمجھتے ھوں۔ ھر قبیلہ یا قوم کے بہت سے قوانین ھر دوسرے قبیلہ یا قوم سے مختلف ھیں لیکن ان تمام مختلف قوانین کے پیچھے نصفت اور سمجھ عقل کے عام اصول مضمر ھیں۔ اس لئے اگر ان کے مطابق قوانین بنائے جائیں تو تمام اقوام ان پر عمل کرنا اور ان سے اپنے تعلقات کو منضبط کرنا پسند کرینگے۔ اس طرح پر ( jus gentium ) بنی نوع انسان کا مشترك قانون ھوا اور ( jus gentium ) کا یہہ تصور جس تك رومن اپنی عملی اور حکمرانی ضرورتوں کی وجہ سے پہونچے یونانیوں کے "بنی نوع انسان کے مشترك قوانین" کے مشابہ ھوا۔ جس تك یونانی مجرد طور پر اپنے فلسفہ قوانین کے وجہ سے پہونچے تھے۔ ان دونوں میں فرق یہہ تھا

کہ رومی تصور تجربہ پر مبنی اور استقرائی تھا۔ اور اسی لئے کلیتہ مجرد انصاف یا مجرد عقل پر مبنی نہیں تھا۔

اس نوبت کے بعد رومی سلطنت یا شاہنشاہیت اور رومی دنیا میں دو یا تین اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ( jus gentium ) اور قانون قدرت عام طور پر ایک ہی سمجھے جانے لگے۔ پہلے تو رومن شخصی شاہنشاہی کے قیام سے اکثر بہترین نوجوان دماغوں پر سنیات میں عوام میں اور قانونی پیشہ میں تقرر کے ذریعہ امتیاز حاصل کرنے کا دروازہ بند ہوگیا۔ ان ایسے بہترین دماغوں میں ( Cicero ) بھی تھا۔ اس نے سیاسی سرد بازاری کی وجہ سے عملی میدان کی طرف توجہ کی رواقئین کے فلسفہ کو جو پہلے سے رائج ہو چلا تھا اپنی قابلیت اور عمدہ زبان اور طرز ادا کی وجہ سے ہر دلعزیز بنا دیا۔ خصوصاً " قانون قدرت " کی رواقئین کے فلسفہ میں خاص جگہ تھی۔ سیسرو نے بھی اس پر خاص توجہ کی۔ اور تقریروں اور تحریروں میں فطرت کو اخلاق اور قانون کا اعلیٰ ترین ماخذ ثابت کیا۔ اس کے نزدیک قانون فطرت (Nature) فطرت سے ماخذ ہے۔ انسان کیلئے طبعی ہے۔ یاد سے با ہر قدیم ہے ہر جگہ ایک ہی ہے۔ نہ تغیر و ترمیم پذیر ہے اور نہ تنسیخ پذیر۔ اخلاق کی بنیاد یہی ہے۔ اور قانونی صریحی کے قواعد میں اسکو موجودہ سے زیادہ دخل ہونا چاہئے۔ اس طرح پر رواقئین کا فلسفہ اور اس فلسفہ میں قانون قدرت کے متعلق خاص حصہ اس وقت رومن شاہنشاہیت میں بہت ہر دلعزیز ہوگیا۔ سیاسی میدان کی تنگی کے علاوہ اسکی دوسری وجہ مذہب کا تعلیم یافتہ اشخاص میں نابود ہوجانا بھی تھا۔ غرض یہہ ایقان کہ تمام بنی نوع انسان ایک ہیں۔ قانون قدرت اخلاق اور قانون کی بنیاد ہے بدیہی تصور مانے گئے اور جب پھر رومن شاہنشاہیت تمام متمدن ممالک میں قائم ہوگئی۔ دنیا کے اکثر حصوں پر رومن پرچم لہرانے لگے تو اس

خیال میں اور تقویت ہوئی۔ کیونکہ ایک سلطنت کیلئے ایک قانون بھی ہونا چاہئیے اور یہہ قانون ( jus gentium ) ہی ہو سکتا تھا۔ اور گو واقعتہً اس کو رومن عدالتوں نے بنایا تھا۔ لیکن وہ تمام بنی نوع انسان میں مشترک اور انکے قوانین کے مغز پر مشمول ہے۔ اور اسی لئے وہ عقل انسانی کا تیار ہوا ہے گویا وہ قانون قدرت ہے۔ جسٹینین کے ( Institutes ) میں قانون قدرت اور ( jus getium ) کا یہہ انطباق تقریباً مکمل ہو گیا۔

رواقی فلسفہ کے رواج عام اور رومن شاہنشاہیت کی عالمی وسعت کے علاوہ ایک تیسرے سبب سے بھی اس انطباق میں مدد ملی۔ اور وہ تصور نصفت کا تھا۔ رومنوں کے نزدیک نصفت سے مراد ( fairness ) الفاظ اور اصطلاحات کے ورے انصاف۔ اس قسم کے جذبات جو ایک شریف اور ذی عزت شخص کو دوسروں کیساتھہ معاملات میں ہونے چاہئیں تھے۔ اس طرح پر نصفت کے تصور سے ایک اعلی قانون کا تصور مکمل ہوا۔ اسلئے قانون قدرت ما بعد الطبعیاتی اور فلسفہ کے نقطہ نظر سے وہ قانون ہوا جسے فطرت یا خدا نے بنایا ہے۔ تاریخ اور سیاسیات کے نقطہ نظر سے وہ وہ قانون ہوا جسکی بنی نوع انسان نے مختلف اقوام میں منتظم ہو کر اپنے ارادے سے رواج کے ذریعہ بنایا۔ اور اخلاق اور نفسیات کے نقطہ نظر سے وہ وہ قانون ہوا جو اعلی ( Typical ) انسان کے ان شریفانہ رجحانات اور جذبات کا مظہر ہوا جنکی وجہ سے وہ اپنے ہمسایہ سے ویسا ہی برتاؤ کرنا چاہتا ہے جیسے کہ خود اپنے ساتھہ۔ ان تین تصورات اجماع سے قانون قدرت کا تصور مکمل۔ متوافق اور متوازن ہو گیا۔

## (ج) تیسرا مذہبی دور

از منہ وسطی کا ہے۔ اس میں عیسائی پادریوں نے بڑی آسانی سے فطرت کو خدا سمجھا چنانچہ سینٹ کریسٹم نے کہا کہ جب مین فطرت کہتا ہون میرا مطلب خدا ہوتا ہے کیونکہ یہہ

خدائے تعالی ھی ھے جس نے دنیا کو بنایا ھے ، اور اسی طرح قانون قدرت کو ھی قانون سمجھا گیا ۔ ھم سینٹ پال کا قول لکھہ چکے ھیں کہ کس طرح انھوں نے قانون قدرت کو وہ قانون کہا جو خدائے تعالی نے انسانوں کے دلوں پر کندہ کیا ھے ۔ اسی طرح سینٹ آگسٹائن نے قانون قدرت کو وہ ابدی اور سرمدی قانون سمجھا جو خدا کے شہر کا قانون ھے ۔ غرض یہہ کہ عیسائی پادریوں نے قانون قدرت کو خدا کا بنایا ھوا الھی قانون سمجھا اور اس سے ان کی جو مراد تھی وہ سینٹ تھامس اکوئنم کے الفاظ میں یوں ظاھر کی جاتی ھے کہ ابدی اور الھی قانون جو تمام چیزوں پر حکمران ھے خدا کی جو سب سے بڑا قانون ساز ھے عقل کا مظھر ھے اس کا وہ حصہ جو وحی کے ذریعہ نازل نھیں کیا گیا بلکہ خود انسان کو اس کی عقل کے ذریعہ سکھایا گیا مناسب طور پر قانون قدرت کہا جا سکتا ھے ۔ اور قانون انسانی عقل کا پیدا کردہ سھی لیکن خود انسانی عقل خدا کی عقل کی پیدا کردہ ھے ۔ اس طرح پر قانون قدرت بھی الھی قانون ھوا ۔ غرض عیسائیوں کے نزدیک قانون قدرت وہ مطلق عالمی قانون ھوا ، جو انسان کو بحیثیت انسان کی اس کی عقل کے ذریعہ خدا نے سکھایا ھے اور اس طرح پر وفیسر آلن کے الفاظ میں تیرھویں صدی کے آخر میں قانون قدرت کا مکمل عیسائی تصور جو ھوا وہ رواقئیں کے قانون قدرت کا تصور ھی تھا گو دوسرے الفاظ میں تھا ۔ اس کی تعبیر وحی کے الفاظ میں کیگئی تھی اس کو مذھبی اقتدار حاصل تھا ۔ اورکلیسائی قانون کی اس پر مھر تھی ۔

ظاھر ھے کہ اس دور میں اس تصور کا استعمال زیادہ تر اخلاقی اور مذھبی دائروں میں ھوا کیونکہ اس دور میں قانون کی تحصیل کم ھوتی تھی ، اور س تصور کا ایک مصرف ھمیں اچھی طرح یاد رکھنا چاھئیے کہ پوپ اور شاھنشاہ کے حامی ایک دوسرے کو اس کے خلاف ورزی کا مرتکب گردانتے اور بعض وقت رعایا

نے بھی ان کے قوانین کی خلاف ورزی کو اس وجہ سے جائز سمجھا تھا کہ یہہ قوانین اس قانون قدرت کے خلاف تھے۔ اس طرح پر اس تصور کے ذریعہ اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی برتری کا اعلان کیا جاتا تھا مابعد انسانوں کا یہہ فرض بتایا جاتا تھا کہ وہ ان کی پابندی کریں۔ شہریوں کے اس حق کو کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کریں علانیہ طلب کیا جاتا تھا۔ چاھے یہ حفاظت بغاوت اور ظالم بادشاہوں کی معزولی اور قتل کے ذریعہ ھی ھو۔ بالفاظ دیگر الٰہی انصاف میں تمام قوانین کے ماخذ کو قرار دیکر اس تصور نے قانون صریح کے اقتدار پر روک لگائی اور ان قوانین صریح کے جواز کو قانون قدرت کی مطابقت پر موقوف رکھا۔

## چوتھا۔جدید دور

یہ ازمنہ وسطیٰ کے اختتام اور نشاۃ جدیدہ اور عہد اصلاح سے شروع ھوتا ھے۔ اس دور میں قانون قدرت کا تصور کا استعمال ذیل کے تصورات کے سمجھنے اور حل کرنے میں کیا گیا۔ مثلاً قانون کا ماخذ کیا ھے؟ سیاسی معاشرہ کی ابتدا اور سیاسی اقتدار کی ابتدا کیونکر ھوئی؟ اس دور میں یہ سوالات اس لئے پیدا ھوے کہ ازمنہ وسطیٰ کے سیاسی نظام جن میں پوپ کے اقتدار کو حضرت عیسیٰ کے سینٹ پٹر کے ارشاد سے اور شہنشاہ کے اقتدار کو یا تو پوپ کے اقتدار سے یا راست خدا کے اقتدار سے ماخوذ سمجھا جاتا تھا ختم ھوگئے تھے، اور ضرورت تھی کہ پادشاھت اور مملکت کو کسی دوسرے نظریہ کی بنیاد پر قائم کیا جائے تاکہ ان کی اطاعت کا مسئلہ حل یعنے ان کی اطاعت کا جواز ثابت ھو۔ اس فضا میں اور اس ضرورت کو پورا کرنے فطرت کے تصور کا ایک نیا استعمال کیا گیا۔ ھابس نے ایک حالت فطری (State of Nature) فرض کیا جس میں ھر شخص دوسرے کے ساتھہ مصروف پیکار تھا۔ اس جنگ و جدل کے ختم کرنے انھوں نے اپنے سارے قدرتی حقوق ایک شخص کے سپرد کردئے جسکی اطاعت اسی قانون قدرت

کی وجہ سے واجب ہوگئی۔ بر خلاف ہابس کے لاک نے بھی ایک حالت فطری کو فرض کیا لیکن باھمی جنگ و پیکار نہیں تھی۔ گو ایک شخص کو اختیارات دئے گئے لیکن بغاوت کا حق باقی رکھا گیا۔ اس طرح پر قانون قدرت لاک کے نزدیک آزادی کا حلیف ہوا۔ اور سنہ ۱۷۷۶ع کے امریکہ کے اعلان آزادی میں قانون قدرت فطری حق کے نام سے بصور استناد پکارا گیا۔ اسی اثنا میں روسو نے بھی اپنے ”معاھدہ معاشری“ کے نظریوں کے ذریعہ فطرت اور قانون قدرت کے نئے نئے استعمال کو ھر دلعزیز بناتا رہا جو بہت جلد سنہ ۱۷۸۹ع میں فرنچ کنونشن کے ذریعہ ”اعلان حقوق انسان“ کے نام سے دنیا کے کانون کو کھڑ کھڑا دیا۔

اس طرح پر اب قانون قدرت ایک نئی اور متحرك سیاسی قوت ہوگیا۔ اور گو آزادی۔ مساوات اور اخوت کے تصور پہلے بھی یعنے یونانی اور رومنی قانون قدرت کے تصور میں شامل تھے لیکن خاموش اور سکون کی حالت میں تھے۔ اس دور میں زیادہ تر سیاسی حالات کی وجہ سے یہ سکون ختم ہوگیا اور ان نعروں کے تحت قانون قدرت ایک محرك سیاسی قوت ہوگیا۔

مذکورۂ بالا خصوص کے علاوہ تین اور خصوص میں دور جدید میں قانون قدرت کے اثرات پائے جاتے ھیں۔ (۱) انگریزی قانون میں نصفت کا تصور اس قانون قدرت کے تصور کا رھین منت ھے۔ اور نیز انگریزی قانون میں قانون قدرت سے استناد بھی جا بجا پایا جاتا ھے۔ چنانچہ بلوائن جو ایڈورڈ چھارم کے زمانہ میں گذرے ھیں کہتے ھیں کہ نظائر اور احکام کی عدم موجودگی میں ججوں کو قانون کی پابندی کرنی چاھئے۔ کیونکہ یہ قانون تمام قوانین کی اساس ھے۔ بلاکسٹن نے یہاں تک کہدیا ھے کہ قانون قدرت تمام کرۂ ارض پر قابل پابندی ھے اور کوئی قانون جو اسکے خلاف ھو قانون ھی نہیں۔ اور بلاکسٹن معاھدات معنوی کو جو لارڈ ماسفیلڈ نے جائز رکھا اسی قانون قدرت پر عمل کرنیکی

مطابقت کی وجہ بتاتے ہیں۔ انگریزی قانون میں قانون قدرت پر مبنی قوانین کی چند دوسری مثالیں Writ of mandamus ، انگریزی مرکنٹایل لا ، اور قانون ٹارٹس میں معقول آدمی کا معیار احتیاط ہیں۔ باوجود اتنے اثر کے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ انگریزی قانون زیادہ تر تجربہ سے بنا ہے اور تجربہ پر مبنی ہے۔ مجرد اصولوں کا اس پر نسبتاً کم رہا ہے۔ نظائر اور احکام کی موجودگی میں مجرد اصولوں پر عمل کم ہوتا تھا۔

۲ قانون بین الاقوام کے اساتذہ مثلاً گروشیس۔ جنٹی لس۔ ایبنیز ، اور پوفن ڈرف نے قانون قدرت ہی کو اس قانون کا سنگ بنیاد بنایا۔ کیونکہ قانون قدرت جب نبی نوع انسان کا مشترک قانون ہوا تو اس پر مملکتوں کے درمیان بھی عمل ہونا چاہئے غرض اس قانون کے بہت سے اصول رومن Jus gentium سے لئے گئے اسی لئے پہلے پہل اس کا نام بھی Jus gentium رکھا گیا۔ جہاں Jus gentium سے مراد اجانب یا اجنبی قبائل میں مشترک قانون نہیں تھی۔ بلکہ مختلف مملکتوں کے درمیانی تعلقات کو منضبط کرنیوالا قانون۔ اور حال حال ہی میں قانون بین الاقوام کا نام اس قانون کو دیا گیا۔

۳ آجکل جرمنی فرانس اور اطالیہ میں قانون قدرت سے مراد قانونی تصورات اور عام قانونی نظریوں کی ما بعد الطبعیاتی اساس سمجھی جارہی ہے۔ ان ممالک کے اساتذہ نے جن کو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں مابعد الطبعیاتی اسکول کے اساتذہ کہتے ہیں ، اور جن کے علم اصول قانون کا طریق کار مابعد الطبعیاتی ہے اس اصول پر عمل کرکے تمام انسانوں کی ساخت ایک ہی ہے ، ان کے تمام افعال عقل سے (اور اسی لئے انصاف) سے منضبط ہوتے ہیں ، قانون کا ایک نظریہ بتایا ہے جسمیں تمام قوانین کی اساس کو مجرد عقل ٹھیرایا ہے۔ کانٹ کی تصانیف میں یہ نظریہ منتہیٰ کو پہنچا ہے اس میں واقعی قوانین کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اور اسی لئے یہ نظریہ قانون موجودہ حقیقتوں سے دور ہوگیا ہے۔

آخر میں ھمکو اچھی طرح ذھن نشیں کرلینا چاھئے کہ مجرد عقل انسانی یا فطرت انسان پر مبنی حق و انصاف کے مجرد تصورات اور اسی لئے قانون قدرت کسی بھی مجموعہ قانون کی اساس نہیں ھوسکتے۔ کیونکہ بقول (Spinozo) "عقل پارہ کا ایك ایسا صندوق ھے جس پر کوئی کھڑے نہیں ھوسکتا"۔ مثلاً دیکھئے کہ ازواج ھی کے متعلق کوئی قانون محض عقل یا فطرت پر مبنی نہیں ھوسکتا مثلاً کہئے کہ عقل پر مبنی قانون کی رو سے تعدد ازدواج اچھا ھے یا صرف ایك بیوی سے مذھبی نکاح کرنا یا صرف ایك بیوی سے معاھدہ کی رو سے نکاح کرنا، یا ھر شخص کا اپنے لئے نر اور مادہ کا آزادی کیساتھ انتخاب کرکے اس وقت تك اسکے ساتھ رھنا جب تك کہ جی چاھے۔ یا موزوں نر اور مادے کا انتخاب سرکاری عہدہ داروں کے ذریعہ ھونا؟ اسی طرح جرائم کی سزا کو لیجئے کہ محض عقل پر مبنی قانون کی رو سے سزا کس بنیاد پر دی جانی چاھئے کیا جرائم کو دبانے کیلئے اور اسی لئے قطع ید وغیرہ ھونا چاھئے جیسا کہ افلاطون کہتا ھے۔؟ کیا تعلیم کیلئے؟ (ارسطو) کیا بقول بنتھم ڈرانے کیلئے؟ یا کیا بقول کانٹ محض اخلاقی کفارہ کیلئے؟ یا بقول (Lonbross) اور امریکہ کے بعض اساتذہ کے مجرموں کو سزا دینی ھی نہیں چاھئے بلکہ انکے علاج کیلئے انہیں دواخانہ بھیجنا چاھئے۔ ان مثالوں سے ظاھر ھوگا کہ عقلوں میں کیسا اختلاف ھوسکتا ھے۔ اور یہ کہ مجرد عقل پر کسی قانون کو مبنی کرنا کتنا دشوار ھے اور نیز یہ بھی کہ محض قانون قدرت ھی کسی قوانین کی اساس نہیں ھوسکتا کیونکہ اسکی تعریف ھی یہی ھے کہ وہ عقل انسانی کا بتایا یا سکھایا ھوا عالمی مطلق یا اخلاقی قانون ھے۔

مگر قانون قدرت کے تصور کو بے سود اور لغو سمجھنا بھی غلطی ھوگی۔ بات یہ ھے کہ قوانین کی بھی مثل انسانوں اور قوموں کے عمر ھوتی ھے۔ نہ صرف اسکے منفرد قواعد اور نظریہ پرانے اور دور از کار ھوجاتے ھیں بلکہ وہ قومی اور تاریخی حالات جن میں کسی قوانین کا نشو نما ھوتا ھے کلیۃً بدل جاتے ھیں۔ اسی وجہ سے بسا اوقات کل نظام

قانون کا بدلنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ ان انسانی وضع کردہ قوانین سے حالات کے بدل جانیکی وجہ سے انصاف نہیں ظلم ہونے لگتا ہے۔ جیسا کہ مثلاً اٹھا ئیسویں صدی کے آخر مین فرانس میں ہوا۔ ایسے زمانون میں قومون کو حقیقی موجودہ قوانین سے بد ظنی ہوکر ایڈیل قوانین کی تلاش ہوتی ہے اسوقت قانون کا یہ تصور کہ قانون ایک عالمی مطلق اور اخلاقی قانون کا مظہر ہے کام آتا ہے۔ بالفاظ دیگر قانون قدرت ایک قیصر سے دوسرے قیصر کو اپیل کرنیکا مفید اور ضروری کام دیتا ہے۔ گو آجکل جماعات مقننہ کے ذریعہ قانون میں اکثر ترمیمیں ہوجاتی ہیں۔ مگر پھر بھی کون کہ سکتا ہے کہ یہ تصور جو ماضی میں اتنا کام آیا ہے اور جس کے ذریعہ مذکورۂ بالا ضروری کام انجام پاسکتا ہے بلکہ بے ضروری اور لغو ہوگیا ہے ؟

خلاصہ یہ ہوا کہ قانون کا یہ تصور کہ وہ ایک مطلق عالمی اور اخلاقی آصول کا مظہر ہے مابعد الطبعیاتی نقطۂ نظر سے ٹھیک ہے۔ لیکن قانونی نقطہ نظر سے گو بے سود نہیں لیکن چنداں مفید اور صحیح بھی نہیں۔ وہ کسی صحیح نظریہ قانون میں کسی مجموعہ قوانین کی اساس نہیں بن سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر وہ تجربہ سے موجودہ حقیقی قوانین کے تجربہ سے دور ہے۔ بلا شبہ روما کا قانون اجانب (J.G.) ایسے قوانین کے تجربہ پر مبنی تھا لیکن اب جب کہ زمین کی طنابیں کٹ گئی ہیں اور کل روئے زمین کے قوانین کے تجربہ کی تحصیل ہوسکتی ہے اور رومنی دنیا کے مقابلہ کرتے آج کل دنیا کے حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ کایا پلٹ ہوگئی ہے، ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ جن عام آصولوں پر یہ قانون اجانب مشمول تھا اب بھی کلیۃً صحیح ہیں۔ مزید متقابلہ تحصیل ضروری ہے۔ ایسی متقابلہ تحصیل آجکل جرمنی اور فرانس میں بڑے پیمانوں پر جاری ہے۔ اسکی تکمیل کے بعد ہمیں علم آصول قانون کے عام آصولوں کے لئے موجودہ واقعی قوانین کے تجربوں پر مبنی اب سے زیادہ اچھا مواد مل جائیگا۔ لیکن پھر بھی اگر ہم

قانون کی یہ تعریف کریں گے کہ وہ مطلق عالمی اور اسی لئے اخلاق آصول کا مظہر ہے تو یہ تعریف یك رخی ہوگی۔ کیونکہ ماحول اور قومی ضروریات کے اختلاف کی وجہ سے تفصیلات اور جزئیات میں فرق ہوگا اور پھر ہمیں یہ حقیقت نہیں فراموش کرنی چاہئیے کہ دنیا کی کوئی حکومت اپنے وضع کردہ قوانین کی پابندی پر کسی دوسرے آصول کی پابندی کو چاہے وہ مطلق اور عالمی اور اخلاقی کیوں نہو ترجیع دیگی۔ بالفاظ دیگر جب تك ان مطلق عالمی اور اخلاقی اصولوں کے پیچھے حکومت کی قوت نافذہ نہ ہو وہ صحیح معنی میں قانون نہیں بن سکتے۔ آجکل جب کہ ہمارے قوانین نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ ہیں، ججوں کی قانون قدرت کے استفسار کے ذریعہ خود اختیاری رایوں کو روکنے میں حکومت زیادہ صحیح ہے کیونکہ وگرنہ قوانین کی Certainty جاتی رہتی ہے۔

# غم

از

جوش ملیح آبادی

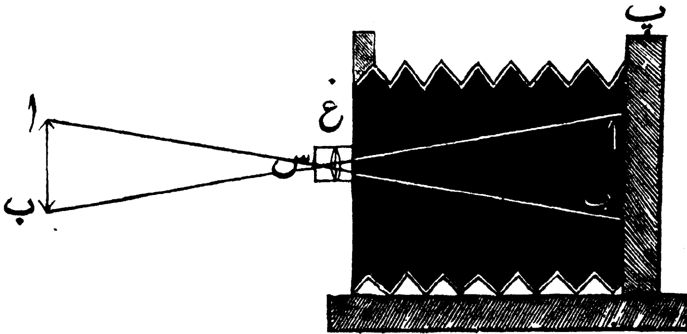
رخ پہ ڈالے ہوئے سیاہ نقاب
غم نے آکر کیا یہ مجھ سے خطاب۔
مجھ کو بھیجا ہے لالہ زاروں نے
تیری گذری ہوی بہاروں نے
شمعیں ماضی کی خوابگاہوں کی
تجھ سے طالب ہیں سرد آہوں کی
خواب پیشیں نے تیرے دی ہے یہ رائے
اب نہ تیری پلک جھپکنے پائے
اس تبسم میں تھا جو وجہ نمو
تجھ سے مانگے ہیں خون کے آنسو
جوش سن کر یہ داستان ستم
میں یہ کہتا ہوا بڑھا سوئے غم
اہل دل جز ترے کسے چاہیں
آ کے گردن میں ڈالدوں باہیں
جب ملا غم کو یہ لطیف جواب
مسکرانے لگا الٹ کے نقاب

# عکاسی

از

جناب محمود علی صاحب متعلم سال دوم (حیاتیات)

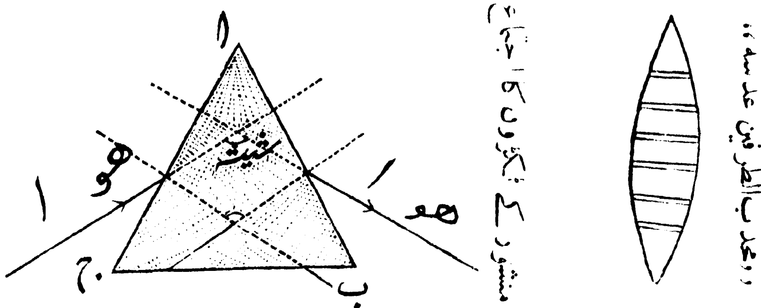
**عکسالہ کی تشریح** یہ آلہ ایک قائمہ دار صندوق پر مشتمل ہے جسکے دو مقابل کے پہلو انتصابی اوراستوار ہوتے ہیں۔ ان پہلؤوں کے درمیانی فاصلہ کو کم وبیش کرنے کے لئے دوسرے دو پہلو چمڑے کے بنائے جاتے ہیں۔ اور پیچوں کے ذریعہ ایسا انتظام کردیا گیا ہے کہ آن کو حسب ضرورت گھٹا بڑھا سکتے ہیں۔ عکسالہ کی اندرونی سطح کامل طور پر سیاہ ہوتی ہے۔




اسکے ایک استوار پہلو کے وسط میں ایک آستوانہ نما نلی لگی ہوتی ہے۔ جسکے وسط میں ایک سوراخ س ہوتا ہے۔ اسپر ایک ٹوپی ہوتی ہے جسکو بوقت ضرورت سوراخ پر سے علحدہ کرسکتے ہیں اسے "lens cap" کہتے ہیں۔ اس استوانہ نما نلی کے اختتام پر ایک محدب الطرفین عدسہ لگا رہتا ہے اور اسکے مقابل عکسالہ کے دوسرے پہلو پر اندھے شیشہ کا نیم شفاف پردہ پ لگا رہتا ہے۔ اسے Focussing screen کہتے ہیں عکس لیتے وقت اسے جدا کرلیتے ہیں اور اسکی جگہ عکاسی کی تختی رکھدیتے ہیں۔

عکسا له کسی شخص الف ـ ب کے سامنے اسطرح رکھا جا تا ھے که جب اسکی شعائیں عدسے میں سے گزریں تو عدسه کے پیچھے آس شخص کا حقیقی معکوس خیال بن جا ئے ۔ عکسا له کا حصه جو پردہ پ کے بعد ھوتا ھے کھل سکتا ھے اور یہاں سے عکاس (Photographer) شخص کے معکوس خیال کو پردہ پ پر دیکھ سکتا ھے اور اسطرح اندازہ لگاتا ھے که آیا عکس ٹھیک آیا یا نہیں اور یه که کسی طرف مدھم تو نہیں ھے ۔ ان تمام آمور کا لحاظ کرتے پردہ پ کو پیچوں کے ذریعه اسطرح حرکت دیتا ھے که اسکا محل خیال کے محل پر پہنچ جائے اور اسپر خیال بوضاحت نظر آنے لگے ۔ اب عکاس Focussing screen کو جدا کرلیتا ھے اور اسکی جگه Dark slide جو عکسا له میں ھوتی ھے خود بخود پھسل کر آجاتی ھے ۔ اس میں ایك یا دو عکاسی کے حساس تختیاں ھوتی ھیں جو ایك پتلی پرت کے اٹھانے پر جو آنکے سامنے ھوتا ھے خیال کے محل پر آجاتی ھیں ۔ اب lens cap کو سوراخ پر سے ھٹاتے ھیں اور ایك معین وقفه کے بعد پھر بند کردیتے ھیں ۔ اسطرح تختی کے شعاعوں کے زیر اثر رھنے کے بعد آسپر خیال کی تصویر بنجاتی ھے جس سے پھر سیدھی اور مستقل تصویر بنا لیتے ھیں ۔

**عدسے** ۔ عدسه کو ھم یوں تصور کرسکتے ھیں که وہ گویا منشور کے ٹکڑوں کا اجتماع ھے جو ایکدوسرے کیساتھ جوڑکر رکھدئے گئے ھیں اور اب چونکه شعاع ھوا سے شیشه میں یعنی لطیف واسطه سے کثیف واسطه میں داخل ھورھی ھے اسلئے ھر منشور کے اندر اسکی یه کیفیت ھوگی که اپنا اصلی راسته چھوڑکر نقطۂ وقوع سے کھنچے ھوئے فصل پر کے عمود کی طرف مڑجائیگی ،،

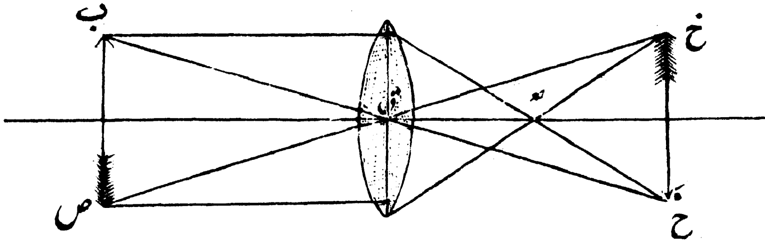



پھر جب منشور سے خارج ہوگی تو آسکا داخلہ کثیف واسطہ سے لطیف واسطہ میں ہوگا ایسی صورتوں میں شعاع سطح فصل پر کے عمود سے پرے ہٹ جائیگی اگر عدسہ پتلا ہو تو آسکی ساخت میں جو مفروضہ منشور ہیں آن میں سے ہر ایک کا انعطاف انگیز زاویہ اپنے فصل محور کا متناسب ہوگا اسلئے ان تمام شعاعوں کا عدسے میں سے گزر کر ایك نقطـہ کی طرف رجوع کرنا ایك امر مستلزم ہے - بعض شعاعوں کا راستہ حسب ذیل ہوگا

(۱) وہ شعاعیں جو عدسہ کے مرکز میں سے گزرتی ہیں آنکی سمت حرکت میں کوئی تغیر نہیں ہوتا -

(۲) وہ شعاعیں جو عدسہ کی سطح سے محور اصلی کے متوازی ٹکراتی ہیں وہ اسطرح منعطف ہوجاتی ہیں کہ سب کی سب عدسہ کے ماسکۂ اصلی میں سے گزرتی ہیں -

(۳) وہ شعاعیں جو عدسہ کے ماسکۂ اصلی میں سے گزرکر عدسہ کی سطح سے ٹکراتی ہیں وہ سب انعطاف کے بعد محور اصلی کے متوازی ہوجاتی ہیں -




شکل میں ص۔ب ایک منور شخص عدسہ کے محور اصلی پر ماسکۂ اصلی سے پرے رکھا ہے۔ شعاعوں کے راستوں کی جو تعین ہوئی تھی اس سے ظاہر ہے کہ ب کا خیال خ پر ہوگا۔ اسیطرح ص کا خیال خ پر ہوگا۔ پھر شکل سے ظاہر ہیکہ خیال حقیقی اور معکوس ہے اور عکاسی کی تختی میں اسی بناء پر خیال معکوس آتا ہے اور شخص کی ہر طرح ضد ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ حصے جو شخص میں سفید ہوتے ہیں سیاہ نظر آتے ہیں ور سیاہ سفید، سایہ دار حصہ روشن نظر آتا ہے اور روشن احصہ سایہ دار۔ لیکن یہ خیال exposure -کے بعد محسوس نہیں ہوتا بلکہ Development کے بعد نظر آتا ہے

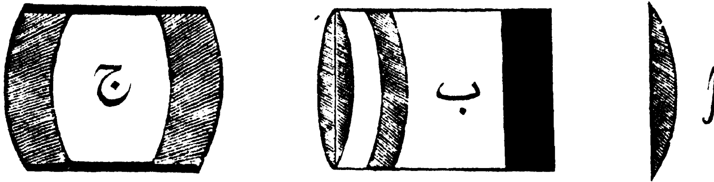
عکسالہ میں منظر کے موقع ومحل کا لحاظ کرتے مختلف قسم کے عدسہ ستعمال کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے چند کا حال درج ذیل ہے۔

(۱) Single lens :- یہ ایکطرف محدب ہوتا ہے اور دوسری طرف مسطح۔ اسکا قطر اسکے طول ماسکہ کا ۱/۱۰ ہوتا ہے اور یہ تین ٹکڑوں پر مشتمل ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۱)

(۲) Rapid symmetrical lens اسمیں دو عدسے اسطرح مرتب ہوتے ہیں کہ انکی مقعر سطحیں بالمقابل ہوتی ہیں۔ انکا قطر اپنے فعل ماسکہ کا ۱/۸ ہوتا ہے (ملاحظہ ہو شکل نمبر ج)

(۳) Wide angle rectilinear and wide angle symmetrical lens اسکا قطر طول ماسکہ کا ۱/۱۸ ہوتا ہے اور یہ بالخصوص اسوقت کام آتا ہے جبکہ عکاس قریب کے شخص کا عکس لینا چاہتا ہے اور دور نہیں جا سکتا۔

(۴) Portrait lens :۔ اسکا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۴ ہوتا ہے۔ اسمیں ٹکڑا ب (ملاحظہ ہو شکل نمبر ب)




کچھ زیادہ کارآمد نہیں ہوتا۔ اگر چاہیں تو اسے جدا بھی کر سکتے ہیں۔

(۵) Group lens :۔ اسکا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۲ ہوتا ہے اور اسکی ساخت portrait lens کی سی ہوتی ہے۔

ان مختلف عدسوں کے استعمال سے یہ بھی لازم ہوجاتا ہے کہ ٹوپی (lens cap) کو عدسوں پر سے مختلف اور معین اوقات کے لئے اٹھایا جائے۔ یہ امر مثالوں سے بخوبی واضح ہوجائیگا۔

اوقات جو عکس لینے کے لئے درکار ہوتے ہیں وہ عدسوں کے قطر اور فعل ماسکہ کے باہمی تناسب پر منحصر ہوتے ہیں مثلاً فرض کیا کہ ایک عدسہ کا قطر فعل ماسکہ کا ۱/۸ ہے اور دوسرے کا اسکے اپنے فعل ماسکہ کا ۱/۱۰ تو مطلوبہ اوقات ان کسروں کے نسب نماؤں کے مربعوں کے متناسب ہونگے چنانچہ ان میں ۶۴ اور ۱۰۰ کا تناسب ہوگا۔ یہ امر بھی قابل یاد داشت ہے کہ مطلوبہ وقت بہ حکم عمومی ثانیہ کی کسر ہوتا ہے

## طریقۂ عمل | یہ عمل فی الحقیقت چار مرحلوں پر منحصر ہے

(۱) تختی کی تیاری (۲) Exposure (۳) Development (۴) Fixing

(۱) تختی کی تیاری :— پہلے جو عکاسی کی تختیاں بنائی جاتی تھیں وہ تانبے یا کاغذ کی چھوٹی سی تختیاں ہوتی تھیں جن پر چاندی کا ایک موٹا سا ورق چڑھا دیا جاتا تھا پھر۔ جب ان پر سے آئیوڈین کے بخارات گزارے جاتے تھے تو سلور آئیوڈائیڈ A gi بن جاتا تھا اور اسطرح تختی حساس ہو جاتی تھی بعد ازاں ۔ سنہ ۱۸۵۰ ع میں Scott Archer نے Wet colloidon استعمال کرنے کی تجویز کی ۔ کچھ عرصہ بعد Dry gelatin والا طریقہ استعمال ہونے لگا جو آجکل بھی مروج ہے اور مفصلہ ذیل ہے

اسکی تیاری میں gelatin کا لسونت جسمیں سلور نائیریٹ Ag No 3 اور کچھ زیادہ مقدار میں امونیم برومائد No 4 Br ملاکر تیار کرلیا جاتا ہے۔اب لسونت کو یہانتک گرم کرتے ہیں کہ سلور برماوئد Ag Br کے رسوب کی چھوٹے چھوٹے دانوں میں تردیب ہوجاتی ہے اس عمل کو Ripening کہتے ہیں ۔ اسکے ٹھوس ہونے کے بعد کاٹتے ہیں اور امونیم برومائڈ کو دھو کر جدا کردیتے ہیں ۔ اب لسونت کو celliloid کی تختیوں پر لگا دیتے ہیں - Nhy Br کی زیادتی اور ripening دونوں اس عمل کو تیز کردیتے ہیں

(۲) Exposure :— عکاسی میں اس اصطلاح سے مراد وہ وقفہ ہے جسمیں ضیاء آفتاب کو عکاسی کی تختی پر عمل کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے ۔ جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے یہ عدسوں کی ساخت پر منحصر ہے اور اسکا انحصار شخص کے محل اور عکسالہ کے مقام پر بھی ہے ۔ مندرجہ ذیل جدول سے مختلف عدسوں کے لئے مختلف مقامات پر مطاوبہ وقت کا اندازہ بآسانی ہوسکیگا

| عدسہ کے قطر اور فصل ماسکہ کی باہمی نسبت | تیز دھوپ اور صاف فضا | [illegible] | [illegible] (سایہ میں) | [illegible] | معمولی کمرے میں |
|---|---|---|---|---|---|
| ۲/۱ | ۲۴۰/۱ ثانیه | ۲۵٦/۱ ثانیه | ۲ ء ۵ ثانیه | ۳۰ ثا نیه | ء ۷۵ ثانیه |
| ۴/۱ | ۲۲/۱ ،، | ۱۲۸/۱ ،، | ۵ ،، | ۱ دقیقه | ۵ ء ۱۰ ثانیه |
| ۸/۱ | ۴۰/۱ ،، | ۱٦/۱ ،، | ۴۰ ،، | ۸ دقیقه | ۱۲ ثانیه |
| ۲۲۶۲۷/۱ | ۵/۱ ،، | ۲/۱ ،، | ۵ دقیقه<br>۲۰ ثانیه | ۱ ساعت<br>۴ دقیقه | ۱ دقیقه<br>۳٦ ثانیه |
| ۳۲/۱ | ۵/٦ ،، | ۱ ،، | ۱۰ دقیقه<br>۴ ثانیه | ۲ ساعت<br>۸ دقیقه | ۳ دقیقه<br>۱۲ ثانیه |
| ۴۴۲۵۵/۱ | ۵/۴ ،، | ۲ ،، | ۲۱ دقیقه | ۲ ساعت<br>۱٦ دقیقه | ٦ دقیقه<br>۲۴ ثانیه |

بعض عکساؤں میں مذکورہ وقت کے اندازہ کے لئے عکس پیما یا ( photometer ) لگا ہوتا ہے - ایسے عکسالے مبتدیوں کے لئے بیحد مفید ہوتے ہیں لیکن تجربہ اور مشق کے بعد جو کام عکس و سما سے متعلق ہے آسے عکاس خود بخوبی انجام دیسکتا ہے

کیمیائی نقطۂ نظر سے یہ عمل محولانہ عاملوں کے ذریعہ ساور برومائڈ Ag Br کو دھاتی چاندی میں تحویل کرنا ہے - تختی پر کا پورا اونجن ( halide ) قابل تحویل ہے - وہ حصص جن تک نور پہنچتا ہے پہلے متاثر ہوتے ہیں اور یہ تاثر ضیاء کی حدت کا متناسب ہوتا ہے - جب متاثرہ حصص پر کافی ،، تفاد ،، پیدا ہوجاتا ہے تو ضیاء ہٹالی جاتی ہے

(ج) Development :- اسے سنہ ۱۸۳۷ ء میں Talbot نے اور جو سچ پوچھو تو ،، بلی ،، نے دریافت کیا - کیونکہ آسنے Nut galls کے extract جو چند Halfexposed کاغذوں پر جنپر سوڈیم کلورائڈ پڑا ہوا تھا اونڈھا دیا - یہ عمل

اس امر پر منحصر ھے کہ کوئی اتنی کمزور عاملیت کا محولا نہ عامل استعمال کیا جائے ضیاء سے غیر متاثرہ حصوں پر اسکا اثر عملا صفر ھو

یہ عمل Darkroom یا تاریک کمرہ میں کرنا چاھئے باھر ضیاء کے عمل سے مزید ساورر وسائٹڈ تحلیل ھو جائیگا جو خیال کو غیر ممتاز کر دیگا - چھوٹی طول موج کی شعاعوں ( نیلی اور بنفشئی ) کا عمل چاندی کے لونجوں پر سب سے زیادہ ھوتا ھے برابر برابر تاثیر کے لئے وقت جو مختلف اللون شعاعوں کے لئے درکار ھے ثانیوں میں حسب ذیل ھے

| | | | |
|---|---|---|---|
| بنفشئی | = | ۱۵ | ثانیہ |
| سبز | = | ۳۷ | " |
| نیلا | = | ۲۹ | " |
| زرد | = | ۳۳۰ | " |
| سرخ | = | ۶۰۰ | " |

بنابریں Dark Room یا تاریک کمرہ میں ایسے لمپ سے کام لیا جاتا ھے جس سے سرخ روشنی حاصل ھوتی ھو

Exposure کے بعد جب تختی پر بعکوس خیال بنجاتا ھے تو اسے با احتیاط تاریک کمرہ مین لا کر Develop کرتے ھیں - اسکا طریقہ یہ ھے کہ تختی پر پہلے Developer اسطرح ڈالتے ھیں کہ آبال نہ پیدا ھو - ۵ سے ۲۰ ثانیوں کے عرصہ میں خیال جہاں سفید تھا سیاہ ھو جاتا ھے اور سیاہ حصے سفید پڑ جاتے ھیں اور نیم شفاف حصے حسب حال بر قرار رھتے ھین - اب اسے کشید کئے ھوئے پانی سے دھو کر پہلے پھٹکڑی کے محلول میں ڈالتے ھیں اور پھر ۵ یا ۶ دقیقوں کے بعد پانی سے دھو

کر Fixing solution میں ڈالدیتے ھیں ۔ اس عمل سے تختی کے پشت کی سیاھی دور ھوجاتی ھے ۔ اب اسے ضیاء سے کوئی ھرج نہیں پہنچ سکتا ۔ یہ تختی اب Negative کے نام سے یاد کی جاتی ھے ۔ اب اسے بخوبی دھو کر سکھا لیا جاتا ھے

Developing Solutions :— مختلف ممالک میں مختلف اغراض کے مدنظر حسب ذیل developers استعمال کئے جاتے ھیں

## Pyrogallol کا قلوی محلول

(الف) اسکا ملک انگلستان میں زیادہ رواج ھے اور اسکے استعمال سے exposure کے خرابیونکی چارہ جوئی آسانی سے ھوسکتی ھے

## Developer نمبر ۱

محلول نمبر ۱ :—

| | |
|---|---|
| پائیروگیلك ترشه | ایك اونس |
| اموئیم بروما ئڈ | ۶۰۰ گرین |
| نائٹرك ترشه | ۲۰ قطرے |
| پانی | ۶ اونس |

محلول نمبر ۲ :—

| | |
|---|---|
| امونیا کا مرتکز محلول (کثافت اضافی ۰۸۸۰) | ۳ ڈرام |
| پانی | ایك پائنٹ |

محلول نمبر ۳

| | |
|---|---|
| محلول نمبر ۱ | ایك اونس |
| پانی | ۱۹ اونس |

اسکی تیاری میں پہلے نائٹرک ترشہ کو ھلکا کیا جاتا ھے پھر پائیرو گیلک ترشہ اور امونیم برومائڈ ملا دئے جاتے ھیں بعد ازیں تینوں محلول ملا دئے جاتے ھیں

## Developer نمبر ۲ فیرس آگزیلیٹ

اسکی تیاری میں آئرن پلرو ٹوسلفیٹ کے ایک پونڈ کو ہم وزن پانی میں حل کرتے میں بعد ازاین ایک پونڈ پوٹاسیم آگزیلیٹ کو بھی پہلے کی طرح ایک پونڈ پانی میں حل کرتے ھیں۔ پھر آئرن پروٹو سلفیٹ کا آبی محلول وزنا ۲ اونس پوٹاسیم آگزیلیٹ کے محلول کے ۱ ۱/۲ اونس میں ملا دیتے ھیں، آمیزہ سرخ مرجانی رنگ کا ھوتا ھے۔ زان بعد امونیم برومائڈ کی ایک اونس قلمون کو ۹ اونس پانی میں حل کر کے تیار شدہ آمیزہ میں ڈال دیتے ھیں اسمیں فائدہ یہ ھے کہ ھاتھون پر دھبے نہیں آتے۔ اس کو فیرس آگزیلیٹ Developer کہتے ھین

## Developer نمبر ۳

جب عکاسی کی تختی gelatin کی ھوتی ھے تو اسے نمبر ۱ Developer سے دھونے میں آسکی سطح پر بھورا یا زردی مائل رنگ باقی رھجاتا ھے یہ اس developer کے استعمال سے دور ھوجاتا ھے۔ اس سے گو development آھستہ آھستہ ھوتا ھے لیکن Negative نہایت نفیس سیاہ رنگ کا ھوتا ھے

محلول نمبر ۱

| | |
|---|---|
| پائیرو گیلک ترشہ | ایک اونس |
| امونیم برومائڈ | ۲۰۰ گرین |
| سوڈیم سلفائٹ | ۴ اونس |
| سٹیرک ترشہ | ٦۰ گرین |
| پانی | ۱۲ اونس |

محلول نمبر ۲

| | |
|---|---|
| امونیا کا مرتکز محلول (کثافت اضافی ۸۸ء) | ۳ ڈرام |
| پانی | ایک پائنٹ |

محول نمبر ۳

| | |
|---|---|
| محلول نمبر ۱ | ۲ اونس |
| پانی | ۲۸ اونس |

اسکی تیاری کے لئے سوڈئیم سلفائٹ کو ۸ اونس پانی میں حل کرتے ھیں پھر مزید پانی کی مقدار ملاکر سٹیرک ترشہ ملاتے ھیں پھر محلول کو پائیروگیلک ترشہ اور امونئیم بروماتڈکیساتھ ملاکر اسکی مجموعی مقدار ۱۳ اونس کی بنالیتے ھیں پھر تینوں محلولوں کو ملادیتے ھیں

**Developer** نمبر ۴ | جب exposure کم ھوتا ھے تو درج ذیل developer استعمال کیا جاتا ھے

محلول نمبر ۱

| | |
|---|---|
| پائیروگیلک ترشہ | ایک اونس |
| نائٹرک ترشہ | ۲۰ قطرے |
| پانی | ٦ اونس |

محلول نمبر ۲

| | |
|---|---|
| سجی | ٦ ڈرام |
| پانی | ایک پائنٹ |

محلول نمبر۳

| | |
|---|---|
| محلول نمبر ۲ | ایک اونس |
| پانی | ۱۹ اونس |

یا اس developer کو یوں بھی تیار کرتے ھیں

| | |
|---|---|
| محلول نمبر ۱ | |
| پائروگیلک ترشہ | ایک اونس |
| امونئیم برومائڈ | ۶۰۰ گرین |
| نائٹرک ترشہ | ۲۰ قطرے |
| پانی | ۶ اونس |
| محلول نمبر ۲ | |
| کاسٹک پوٹاش | ۱۰ ڈرام |
| پانی | ایک پائنٹ |
| محلول نمبر ۳ | |
| محلول نمبر ۱ | ایک اونس |
| پانی | ۱۹ اونس |

یہ معمولی محلول کے مطابق کام میں لائے جاتے ھیں

**Developer** نمبر ۵ | Hydroquinone.

| | |
|---|---|
| محلول نمبر ۱ | ۲/۳ اونس |
| نائٹرک ترشہ | ۲۰ قطرے |
| پانی | ۶ اونس |
| محلول نمبر ۲ | |
| امونیا کا مرتکز محلول (کثافت اضافی ۰۸۸۰ ء) | ۸۰ منم |

| | |
|---|---|
| پانی | ایك پائنٹ |
| محلول نمبر ۳ | |
| محلول نمبر ۱ | ایك اونس |
| پانی | ۱۹ اونس |
| محلول نمبر ۴ | |
| امونئم برومائڈ | ایك اونس |
| پانی | ۱۰ اونس |

جب exposure با ضابطه هوتا هے تو محلول نمبر ۲ و نمبر ۳ معمولی developer کیساتھه استعمال کئے جاتے هیں لیکن جب exposure حد سے زیاده هوجاتا هے تو نمبر ۴ استعمال کیا جاتا هے لیکن اسوقت بهی چند قطرات کافی هوتے هیں۔

**انتباه** ان تمام مذکورۂ بالا احتیاطوں کے باوجود Negative میں چند خرابیاں رهجاتی هیں مثلاً:—

کبهی اسپر جهریاں یا جهالر کیطرح سلوٹیں نظر آتی هیں۔ اسکی وجه یه هے جب هلکا پانی استعمال کیا جاتا هے تو اس قسم کی جهریاں پڑ جاتی هیں۔ اسکے دفعیه کے لئے پانی چند گرین (میگنیسئم سلفیٹ) Mg So 40 7w20 ملا دیا جائے تو بهتر هے۔

یا تختی پر کبهی کثیف اور شفاف داغ بهی پڑ جاتے هیں یه اگر بالکل مدور اور شفاف هوں تو سمجهه لینا چاهئے که developer میں بلبلے پڑ جانےکی وجه سے هے اسلئے عکاس کو چاهئے که آونٹ کے بالوں کا ایك برش تختی پر پهیر دیا کرے یا تختی پر بعض اوقات لکیریں پڑ جاتی هیں اور یه اسطرح هوتا هے که developer استعمال کرتے وقت جب تختی کا ایك حصه تو تر هوجاتا هے اور دوسرا خشك رهتا هے تو اس تر حصه کے دامن

پر خود بخود خط پڑ جاتا ھے اسلئے عکاس کو چاھئے developer کو بہ یك وقت پوری تختی پر ڈالے۔ جب تختی develop ھو جاتی ھے تو اسے پھٹکڑی کے محلول میں ڈالدیا جاتا ھے پھٹکڑی کے محلول کی تیاری کے لئے ۲ اونس پھٹکڑی کو گرم پانی کی ایك پائنٹ مقدار میں حل کرتے ھیں۔

**Fixing** اس عمل سے غیر متاثرہ سلور برومائڈ کو سوڈیم تھائیو سلفیٹ میں حل کر کے تختی پر سے جدا کرتے ھیں کیونکہ اگر تختی بغیر اس عمل کے بغیر ضیاء میں لائی جائیگی تو غیر متاثر سلور برومائڈ بھی تحلیل ھو جائیگا۔ اور اسطرح خیال خراب ھو جائیگا۔ اسے سب سے پہلے سنہ ۱۸۴۰ع میں Sir Johnson Hershell نے دریافت کیا اس محلول کی تیاری کے لئے ٥ اونس "Hypo" یا Hyposulphite of Soda یا Sodium thiosulphate کو ایك پائنٹ گرم پانی میں حل کرتے ھیں۔

**Printing** اس عمل سے عکس یا خیال پھر سیدھا ھو جاتا ھے۔ تختی کے آس رخ پر جسپر عکس ھو Printing paper رکھدیا جاتا ھے۔ پھر اسکو چوکھٹے میں کس کر خشك ھونے کے لئے چھوڑ دیتے ھیں۔ سوکھنے کے بعد اسے نکال لیتے ھیں اور یونہی جسقدر تصویریں درکار ھوتی ھیں چھاپ لیتے ھیں اب tonning کے ذریعہ اسکے رنگ کو واضح اور دیر پا کیا جاتا ھے Printing paper یا تو Velox کی قسم کے ھوتے ھیں جنکو Baekeland نے ایجاد کیا یا Albumenized ھوتے ھیں۔ Velox کی مثل کے کاغذ بالکل عکاسی کی تختیوں کی طرح ھوتے ھیں کیونکہ ان میں بھی حساس شئے سلور برومائڈ AgBr ھوتی ھے جو gelatin میں معلق رھتی ھے۔ اور انکو بھی آن تختیوں کی طرح develop, expose اور Fix کرتے ھیں Albumenized paper میں حساس شئے سلور کلورائڈ ھے جو انڈے کی

سفیدی ( Albumen ) میں تعلیق کی حالت میں ہوتی ہے اور اس سے چاندی گلابی رنگ میں لسوتی حالت میں آزاد ہوتی ہے

جب Printing paper پر عکس آجاتا ہے جو سیدھا ہوتا ہے تو پھر tonning کا عمل شروع ہوتا ہے۔

**Tonning** اس عمل میں سوڈیم کلورو آریٹ چاندی کیساتھ عمل کرتا ہے اور اسکی جگہہ سونے کی پتلی سی تہ جم جاتی ہے



$NaAuCl_4 + 3Ag - NaCl + 3AgCl - Au$

اس مطلب کے لئے مختلف Tonning Baths مستعمل ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں

| | |
|---|---|
| (۱) Auric chloride | ایک اونس |
| پانی | ۱۴ اونس |
| سوڈیم ایسٹیٹ | ۲۰ گرین |

یہ ارغوانی رنگ پیدا کرنے کے لئے بہت موزوں ہے

| | |
|---|---|
| (۲) Auric chloride | ایک اونس |
| پانی | ۱۴ اونس |
| سوڈیم بائی کاربونیٹ | ۳ گرین |

یہ نیز بھورا رنگ حاصل کرنے کے لئے بہت مفید ہے

(۳) Platinum Bath :— یہ مثل Acetate Bath کے ہوتا ہے لیکن اسمیں بجائے Auric chloride کے Platinic chloride استعمال کیا جاتا ہے

**طریقہ عمل** Prints کو ایک تشت میں جسمیں صاف پانی رکھا ہوتا ہے

اسطرح اوپر تلے رکھتے ھیں کہ تصویر کے رخ نیچے ھوں۔ اسکے بعد انپر یکے بعد دیگرے Tonning Solution ڈالتے ھیں۔ اسطرح لورن کرنے سے انکا رنگ بتدریج بدلتا جاتا ھے اور سیپی کا سا ھونے لگتا ھے۔ اب یہ عکاس کے اختیار میں ھے انکا رنگ جہاں تک ھوسکے tonning کے ذریعہ گہرا یا ھلکا رکھے۔ پندرہ سے بیس دقیقوں میں یہ عمل اختتام کو پہنچ جاتا ھے اسکے بعد Fixing شروع ھوتی ھے۔ اس مطلب کے لئے محاول اسطرح تیار کیا جاتا ھے کہ 2½ اونس سوڈئم ھائپو سلفائٹ کو ایک پائنٹ پانی میں حل کرتے ھیں، tonning کے بعد prints کو اس fixing محلول میں ایک ربع ساعت تک پڑا رھنے دیتے ھیں پھر اسے پانی سے بخوبی دھو لیتے ھیں اور اب نکالکر کسی صاف تولیہ سے خشک کر لیتے ھیں۔ اب ان prints کو عمدگی اور زیبائش سے کاٹ کر عام پسند اور مرغوب خاطر بنا لیا جاسکتا ھے۔

---

*

# نظم

## از

جناب علی حسنین صاحب زیبا ( جو کابینه جدیده کی کرسی نشینی کے موقع پر پڑھی گئی تھی )

خدا هی جانے سحر کیا بهار آب و گل میں هے　　نیا خیال ذهن میں نئی آمنگ دل میں هے

جمود حسن کا ابھی فنا هوا خزاں کے ساته　　سکوت نئے نواز بھی هوا هوا خزاں کے ساته

دل سکوں پسند آئه که یه عمل کا دور هے　　بهار سال نو سے آج رنگ هی کچه اور هے

بهار رفته کر کے یاد کچه هوا جو انفعال　　هوا جو بلبلوں کو بھی چمن کے حسن کا خیال

چمن تھا جسکی جان آسے چمن کی جان بنا دیا　　خود اپنے میں سے چن کے ایك باغبان بنا دیا

عجب هی کیا بنادے گر اسی کو گلستان نیا　　چمن وهی سهی مگر ملا هے باغبان نیا

عجب هی کیا جو باغباں چمن کی رت هی پھیر دے　　یه بلبلوں کو حسن انتخاب کا صله ملے

هوا بدلدے یوں چمن کی یه هوا بهار کی　　گلوں په اسطرح اثر کرے هوا بهار کی

یه عارضی بهار هی بهار جاوداں بنے　　یه موسمی شباب بھی شباب جاوداں بنے

گلوں کی عطر بیزیوں کا هے چمن میں انحصار　　چمن کے رنگ صحن میں ابھی هے منحصر بهار

عجب هی کیا بهار یه چمن میں یوں مقیم هو　　جهاں جهاں نسیم هے وهاں وهاں شمیم هو

چمن کے بلبلوں کو عشق صرف گلستاں سے هے　　بدلدے یوں انهیں همیں امید باغباں سے هے

فسانهٔ وطن پڑهیں فسانهٔ چمن کے ساته　　ترانهٔ وطن پڑهیں ترانه چمن کے ساته

*

# لفظ خلجی کی اصلیت

از

جناب سید سراج الدین احمد صاحب - متعلم ایم - اے آخری (تاریخ)

ضیاء الدین برنی نے تاریخ فیروز شاهی میں لکھا هے که خلجی ترکی النسل نہیں هیں (۱) - اگر وہ ترکی النسل ہوتے تو کیقباد کے عہد میں ترکی امرا جلال الدین خلجی کا ساتھ دیتے - جلال الدین کا نسبی تعلق ایسی نسل سے تھا جو ترکی نہیں تھی - اسی وجہ سے ترکوں پر اسے اعتماد نہ تھا اور نہ ترك اسے اپنی نسل سے سمجھتے تھے - چنانچہ انہوں نے اسی بناء پر اقتدار حاصل کرنے کے لئے اپنی علحدہ جماعت بنالی اور خلجیوں کا جو جلال الدین کے ساتھ تھے ممکنہ قوت کے ساتھ مقابلہ کیا -

خلجیوں کی نسبت یہ قصہ مشہور هے که اغوث خاں نے بہت سے قبائل آباد کئے تھے - ایك دفعه وہ فوج لیکر جا رھا تھا راستہ میں چند سپاھی پیچھے رہ گئے - ان میں سے ایك سپاھی کی بیوی کی زچگی ہوئی - جب یہ اغوث خاں کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اغوث خاں نے دیری کا سبب دریافت کیا تو انہوں نے سارا ماجرا بیان کیا - اس وقت سے وہ گاؤں جہاں زچگی ہوئی تھی خل اج (۲) کے نام سے مشہور ہوا ، اور اس بچہ کی اولاد خلجی کہلانے لگی جو پہاڑ سیستان اور غور کے قریب آباد ہوئے -

---

۱ - تاریخ فیروز شاهی مصنفۂ ضیاء الدین برنی صفحه (۱۷۱) - آخری سطر - ”و چون اصلی دیگر داشت نه او را با ترکان استواری بود و نه ترکان او را از بطانۂ خود میدانستند“ ، الیٹ جلد سوم صفحه (۱۳۴) سطر (۱۰)

۲ - خل - چھوڑنا اور اج - بھوکا -

فرشته نے لکھا ھے کہ تاریخ سلجوقیاں کے مصنف کے قول کے مطابق ترک بن یافث اوربعض تواریخ میں لکھا ھے کہ نوح کے فرزند یافث، کے گیارہ فرزند تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خلج تھا۔ اسی کی اولاد کو خلجی کہتے ھیں (۱)۔ فرشتہ کے نزدیک یہ قول اس لئے صحیح ھے کہ تواریخ غزنویہ میں لکھا ھوا ھیکہ سلطان ناصرالدین سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی غازی کے بہت سے امرا قوم خلج سے تھے۔ ان کا عہد چنگیز خاں کے عہد سے پہلے کا ھے۔ لہذا قالج خاں قوم خلج سے تھا اور بادشاہ جلال الدین فیروز شاہ دھلوی اور سلطان محمود مالوی (۲)اس کی اولاد سے ھیں۔ طبقات اکبری میں لکھا ھے کہ محمد خلجی مانڈوی اور جلال الدین خلجی، قالج خاں کے پوتے تھے۔ قالج خاں چنگیز خاں کا داماد تھا۔

جب چنگیز خاں کو عروج حاصل ھوا تووہ التمش کے عہد میں ھندوستان آیا اور خوارزم شاہ کو سنہ ۱۲۲۴ھ میں شکشت دی۔ اسوقت قالج خاں ملک غور اور گرجستان کے پہاڑی علاقوں میں آباد ھوے۔ قالج (۳) تھوڑے سے تغیر سے خلج ھوگیا اورعام استعمال سے خلج ھوگیا۔ بدایونی نے لکھا ھے کہ قلج اور قالج میں صرف لفظی تکرار ھے ورنہ دونوں ایک ھیں۔ قالج کا الف، قلج کے ق کے زبر کے بجائے استعمال کیا گیا ھےجو ترکی اصول تحریر ھے۔ اب ایرانیوں میں ق کے بجائے خ استعمال کیا جاتا ھے (۴)

---

۱۔ تاریخ فرشتہ مقالہ۔ دوم صفحہ (۸۸) ۔طر (۲۸)

۲۔ طبقات اکبری۔ محمد خلجی مانڈوی صفحہ (۵۷)

۳۔ طبقات اکبری صفحہ (۵۷)

۴۔ منتخب التواریخ مصنفۂ عبدالقادر بدایونی (مترجمۂ رینکنگ)

مورخ مولانا نظام الدین احمد نے لکھا ہے کہ ایک معتبر تاریخ میں میری نظر سے گزرا کہ گروہ خلج، قالج خاں داماد چنگیز کی نسل سے ہے (۱) اور اسکا قصہ یہ ہے کہ قالج خاں اور اسکی بیوی میں جو چنگیز خاں کی بیٹی تھی رنجش پیدا ہوئی مگر چنگیز کے خوف کے باعث سوائے خاطر و مدارت کے کوئی چارہ نہ تھا لیکن قالج کو ہمیشہ رہائی پانیکی دھن سمائی تھی۔ جب چنگیز نے ساحل سندھ پہونچکر سلطان جلال الدین خوارزم کو مغلوب کیا اور ایران و توران کے مہمات سے فارغ ہوا تو وطن واپس ہوا۔ خالج خاں اس زمانہ میں چنگیز کے ساتھ غور و گرجستان کے پہاڑون پر سے گزرتے وقت مورونی آبادی کے لئے، موقع پاکر اپنے عزیز و اقارب کے ساتھ جنکی تعداد تقریبا تیس ہزار تھی اس کوہستانی علاقہ میں آباد ہوا۔ جب چنگیز خاں فوت ہوا تو اس کے بیٹون میں سے کسی نے اسکی پروانہ کی۔ یہان قالج کی نسل بہت پھیلی۔ جون جون سلاطین غور نے ہندوستان کو فتح کیا، خلجی وقتا فوقتا قربت کے باعث ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہیں انہون نے ملازمت اختیار کی اور شہرت حاصل کی (۲)۔

خلجی ایک ترکی قبیلہ تھا جسکا نام ترکی میں کلک (۳) ہوگا۔ انکا چوتھی صدی عیسوی سے پتہ لگتا ہے۔ یہ لوگ بہ نسبت دوسرے ترکون کے بہت دور جنوب میں رہتے تھے۔ یہ مقام زمانہ حال کے لحاظ سے افغانستان کا جنوبی حصہ یعنے سیستان اور ہندوستان کے درمیان کا علاقہ ہے۔ زمانہ قدیم میں یہ لوگ یہان آکر آباد ہوے تھے۔ یہ قبیلہ کس وقت ترکستان سے ترک وطن کر کے یہان آیا اسکا پتہ لگانا اب بلکل ناممکن ہے۔

---

۱- شہاب الدین حکیم کرمانی جونپوری نے اپنی کتاب طبقات محمد شاہی میں خلجی خاندان کی ابتدا چنگیز خان کے داماد قالج خان سے لکھی ہے۔

۲- در اینکہ از تواریخ معتبر ......... صاحب اعتبار شدند طبقات اکبری صفحہ (۵۶) فرشتہ۔ مقالہ دوم صفحہ (۸۸)۔

۳- Kalac

اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مغربی افغانستان میں آکر آباد ہوے ، جہاں بہت عرصہ تک رہے جس کی وجہہ سے یہ افغانی کہلانے لگے ۔ انہوں نے دوسرے بادشاہوں کے تحت بحیثیت سپاہی کے بہت شہرت حاصل کی ۔ لیکن خلجیوں کا تذکرہ سیاسی نقطہ نظر سے کبھی ایک خودمختار اور متحد قوم کے نہیں آیا ۔ بہت زمانہ گزرنے کی وجہہ سے ان کے نام میں تک بہت کچھہ اختلاف ہو گیا ۔

خلجیوں کے سردار ، دوسرے ترکی محافظین کی طرح ہوتے تھے ۔ انہوں نے غزنی اور غوری بادشاہوں کی ملازمتیں اختیار کیں اور خوب نام کمایا ۔ یہی لوگ ہندوستان جاکر وہیں آباد ہو گئے جہاں انہیں اپنی خودمختار خاندانی حکومت قائم کرنے اور سیاسی قابلیت کے اظہار کے مواقع ملے ۔ مثلاً بختیار خلجی نے بنگال میں حکومت قائم کی اور محمد نے مالوہ میں لیکن دھلی کے خاندان خلجی کو خاص اہمیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے زبردست سلطنت قائم کی ۔ ہندوستان میں یہ بجائے خلجی کے خاجی کہلانے لگے ۔ بہلول جس نے ہندوستان میں لودی خاندان کی بناء ڈالی اور ( سنه ۱۴۵۱ سے ۱۵۲۶ ع تک ) دھلی میں حکومت کی ، اسی خلجی قبیلہ سے تھا ۔

موجودہ غلزی ، ترکی خلجیوں ہی کی نسل سے ہیں ۔ لیکن راورٹی نے اس خیال کی تھوڑی سی مخالفت کی ہے ۔ غلزی بھی ترکی النسل ہیں اور یہ اسی قطعہ میں دکھائی دیتے ہیں جہاں خلجی آباد ہیں ۔ ممکن ہے کہ افغانیوں نے اپنے غلط تلفظ کی بناء پر خلجی کے لفظ کو بگاڑ کر غلزی کر دیا ہو ۔ اگر غلزی ، خلجی نہوں تو ان کا پتہ لگانا دشوار ہے ۔ ممکن ہے کہ غزا اور خلج اور دیگر قبائل سے ان کا تعلق ہو جو گیارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک کثرت سے افغانستان آئے اور غزنوی اور غوری بادشاہوں کے پاس بحیثیت جنگی سپاہیوں کے ملازمت کی ۔ مخزن افغانیہ مین غازیوں کی اصیلت اس قصہ

سے واضح کی گئی ھے کہ باٹن کی بیٹی ماٹو نے شاہ حسین سے ناجائز تعلقات پیدا کئے اور بعد ازاں اس سے شادی کرلی ۔ شاہ حسین، غور کا مفرور شہزادہ تھا ۔ ان سے جو لڑکا ھوا وہ غلزی یعنے "فرزند چور" کہلانے لگا ۔ یہیں سے غلزی نام کی ابتدا ھوئی (۱)۔

ملا منہاج الدین (۲) ابو عمر عثمان نے لکھا ھے کہ خلج ایک ترکی قبیلہ ھے جو شمالی ترکستان سے بہت زمانہ قبل نکل گیا ۔ راورٹی نے اسکی وضاحت کے ساتھ یوں تشریح کی ھے کہ شاش، ماؤرالنہر کی سرحد، ندی، اور شہر کا نام ھے ۔ یہ دریائے سیہون پر واقع ھے جو ترکون کی سرحد ھے ۔ یہ حصہ اب تاشقند کہلاتا ھے یہاں غز اور قلج قبائل کے مسلمان آباد تھے ۔ یہی خلجی ترک افغانستان میں آباد ھونے کے بعد خلجی پٹھان کہلانے لگے ۔ سنہ ۶۲۳ ھ میں مغلوں کے مقابلہ کے لئے ایک خلجی جماعت خوارزمی فوج کے ساتھ شریک ھوگئی تھی جس نے سیستان کے ایک ضلع منصورہ پر قبضہ کرلیا ۔ اس جماعت کا سردار ملک خان خلجی تھا ۔ سندھ کے قریب قباچہ سے ملک خاں نے مقابلہ کیا اور مارا گیا ۔ اس کے بعد خلجی فوراً التمش کی پناہ میں چلے گئے ۔ انکی مدد سے التمش نے قباچہ پر حملہ کیا اور اس کا خاتمہ کیا ۔

عربی اصول کے لحاظ سے خلجی کی جمع اخلاج ھے ۔ اس کے علاوہ یہ خلاج بھی کہلاتا ھے لیکن بہت کم ۔ چند مسلمان ھندوستانی مصنفین نے خلج اور خلجی بھی لکھا ۔ جن کی بہت سے یورپین مورخین نے اتباع کی ھے ۔ فرشتہ نے خلج لکھا ھے ۔ اور یوروپینوں کے خیال کے مطابق خلج قبیلہ اور قبیلہ غلزی کے لوگ ایک نہیں ۔ بعضوں نے اس کی یوں تعریف کی ھے کہ خلج اسی نسل سے ھیں جس سے افغانی قبیلہ غلزی ھے ۔

---

۱ ۔ از انسائیکلو پیڈیا آف اسلام ۔ دیکھو لفظ خلجی ( Khaladj )

۲ ۔ طبقات ناصری ۔ مترجمہ راورٹی ۔ صفحات ۔ ۲۸ ۔ ۵۱۱ ۔ ۵۳۹ ۔ ۵۴۸ ۔ ۵۵۰

چونکہ خلج، غوری سلاطین کے عہد اور اس کے پیشتر سے موجود ہیں اور وہ خراسان کے اس حصہ میں بھی آباد تھے جو اب افغانستان کہلاتا ہے۔ لہذا اسی بناء پر ان مورخین نے انہیں نہ صرف افغانی بتلایا ہے بلکہ اس سے بھی اور آگے بڑھکر انہوں نے خلج اور غلزی کو ایک کر دیا۔ دراصل خلج ایک ترکی قبیلہ ہے جس کا شجرہ الاتراک، جامع التواریخ اور ظفر نامہ کے مقدمہ میں تذکرہ ہے۔ انکا ایک حصہ آکر گرم سیر میں بہت زمانہ قبل آباد ہوا تھا۔ وہاں سے ان لوگوں نے ہندوستان آکر سلطان معزالدین کی ملازمت اختیار کی۔ اسی طرح بختیار غلام سمجھا جاتا ہے، یہ غلام نہ تھا بلکہ خلج قبیلہ کا سردار تھا جو غور کے جنوب مغربی سرحد پر آباد تھا۔ بختیار، سلطان معزالدین کے عہد میں ملازمت کی تلاش کرتا ہوا غزنی آیا۔ لیکن یہاں حسب خواہش ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے اس نے ہندوستان کا رخ کیا اور لاہور پہونچا۔ وہاں سے قطب الدین کی مخالفت پر مشرق کی طرف نکل گیا اور ملک المعظم حسام الدین آغل بک سے جا ملا۔ ملک حسام الدین کے تحت دوآبہ کا کثیر حصہ اور دریائے گنگا کا مشرقی حصہ بھی تھا جہاں وہ قطب الدین کے اثر سے بالکل آزاد تھا ایک اور قول کے مطابق سلطان معزالدین نے، اغل بک کو کول کا قلعہ اور اس کے تحت کے علاقے عنایت فرمائے تھے۔ محمد بختیار نے ملک حسام الدین کی ملازمت اختیار کی اور چند مرتبہ ہندوں کے مقابلہ میں اپنی مردانگی کے جوہر دکھائے جس کے صلہ میں ملک نے بختیار کو پٹیتہ بحیثیت جاگیر کے دیا۔ بختیار کی شہرت سنکر خلجی اطراف و اکناف سے اس کے پاس آپہونچے جس سے اس کی قوت میں اضافہ ہوا اور انکی مدد سے اس نے بہار اور اودہ تک قبضہ کر لیا اور لکھنوتی کو اپنا مستقر قرار دیا۔ بختیار کی اس بڑھتی قوت کی خبر پاکر قطب الدین ایبک نے اسے قیمتی لباس مرحمت فرمایا۔ اوائل سنہ ۶۰۲ ھ میں بختیار مارا گیا (۱)۔

---

۱۔ طبقات ناصری۔ ترجمہ راورٹی۔ انڈکس صفحہ (۶۰) خلجی

خلجیوں کی اصلیت کی نسبت ملا منہاج الدین ابو عمر عثمان کا خیال سب میں زیادہ قابل وثوق ہے۔ منہاج الدین، سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں تھا۔ اسکا زمانہ متذکرہ بالا تمام مورخین سے پیشتر کا ہے۔ اس کے قول کے مطابق خلج ایك ترکی قبیلہ ہے جو شمالی ترکستان سے بہت زمانہ قبل نکل گیا۔ صرف قالج خان ھی کی اولاد کا خلجی کہلانا اس لئے غلط ہے کہ اسے کوئی تاریخی اہمیت حاصل نہیں ہے اور بقول فرشتہ تواریخ غزنویہ کے مطابق سبکتگین اور محمود غزنوی کے بہت سے امرا قوم خلج سے تھے جن کا زمانہ قالج خان سے پیشتر کا ہے چونکہ قالج خان ترکی خلجی تھا لہذ دوسرے خلجی امرا کی اولاد کی طرح ان کی اولاد بھی خلجی تھی۔

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور اس سے زیادہ راورٹی نے اس موضوع پر بحث کی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خلجی ترکی النسل ہیں جو افغانستان میں آباد ہوے (۱)۔ ان پر افغانی تہذیب و تمدن اور رسم ورواج کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ بعدمیں جو ترکی آئے انہیں بالکل افغانی سمجھا حالانکہ یہ ترك نژاد ہیں اور ترکستان کے قبیلہ خلج سے ان کا تعلق ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ انہوں نے هندوستان میں قدم رکھنا شروع کیا اور یہیں آباد ہو گئے۔ ترکی بلبن کے عہد تك اتنے قوی ہو گئے کہ بلبن نے التمش کے مسلك کے خلاف انہیں سلطنت کیلئے خطرناك سمجھا اور غلامان چہلگانہ کی بیخ کنی کر کے ترکی قوت کو زبردست زد لگائی۔ بہادر پور میں یغرش خان خلجی کے دونوں بیٹے جلال الدین خلجی اور شہاب الدین خلجی بلبنی فوج میں ملازم تھے۔ کیقباد کے عہد میں ملك الامرا ملك فخر الدین کوتوال کا بھانجا و داماد ملك نظام الدین

---

۱- پروفیسر کرشنا سوامی انیگار اور رچرڈ ٹیمپل دونوں کی رائے ہے کہ خلجی ترکی النسل ہیں جو افغانستان میں آباد ہوے انڈین انٹی کویری سنہ ۱۹۲۲ ع صفحہ (۲۰۵)

بہت قوی ہو گیا اور تمام معاملات سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لیکر وکیل سلطنت بنا یعنے وزارت عظمی حاصل کی اور اپنی طاقت بڑھانے کی کوشش میں اس نے تمام امرا اور عمائدین سلطنت سے مخالفت مول لی۔ آخر کار اس کی نت نئی بد عنوانیوں سے خود بادشاہ تنگ آگیا اور اس کو زہر دیکر مار ڈالا گیا۔ اس وقت ملک جلال الدین فیروز بن ملک یغرش خان خلجی نائب سامانہ اور امیر جائداد تھا۔ بادشاہ نے اسے سامانہ سے طلب کیا اور شائشتہ خاں کا خطاب دیکر برن کا جاگیردار بنایا۔ اور بعد ازاں عرض ممالک کے عہدہ پر فائز کیا۔

ترک خلجیوں کو اپنے برابر والے ترک نہ سمجھتے بلکہ انہیں پٹھان سمجھتے تھے۔ لہذا ان کی یہ کوشش تھی کہ اپنی قوت اور اثر کو برقرار رکھیں تا کہ غیر ترک مثلا خلجی ان پر حکمران نہ ہوں۔ لہذا کیقباد کے فریش ہو جانے کے بعد انہوں نے اس کے بیٹے کیومرث (۱) کو سلطان شمس الدین کے خطاب سے تخت نشین کیا۔ اور اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کی فکر میں انہوں نے خلجی جماعت کو جو جلال الدین کی سرکردگی میں قائم ہو گئی تھی، کمزور کرنے کی کوشش کی۔ اور عوام کو خلجیوں سے بدظن کرانے کے لئے انہوں نے خلجی جماعت کے ساتھ برا سلوک کیا، انہیں ذلیل کیا اور حکومت کے ناقابل ٹھہرایا۔

ترکوں کی اس خود غرضی کو مٹانے کی خاطر جلال الدین نے جنگ کی طیاری کی اور اس کے بیٹوں نے فوج کا ایک دستہ لیکر بہادری کے ساتھ محل شاہی پر حملہ کیا اور شمس الدین کو تخت سے اٹھا کر اپنے باپ کے آگے حاضر کیا۔ کیقباد کے

---

۱۔ الیٹ جلد سوم۔ ترجیت الامشار صفحہ (۳۹) آخری سطر۔ شمس الدین کیومرث۔ قران السعدین۔ تمہید صفحہ (۵۰)

خاتمہ کے بعد جلال الدین فیروز شاہ خلجی سنہ ۱۲۸۹ ع میں کیلو کھری میں تخت نشین ہوا اور خاندان خلجی کی بنا ڈالی ۔ اپنے بھائی شہاب الدین مسعود کو یغرش خان کا خطاب دیا اور عرض ممالک کے منصب پر پہونچایا اور اس کے بیٹوں میں علاؤالدین کو جسے وہ اپنے بیٹوں سے زیادہ عزیز سمجھتا تھا دربار کے اعلی امرا میں شامل کیا اور الماس بیگ کو الغ خان کا خطاب دیکر آخر بیگ کیا ۔ دربار میں رہنے سے علاؤالدین سلطنت کے نشیب و فراز اور حکومت کی تمام چالوں سے واقف ہوگیا اور سنہ ۱۲۹۶ ع میں تخت نشین ہوکر اس نے تمام ہندوستان پر مستحکم اور منظم حکومت کی ۔

---

# نائٹروجن کی اہمیت اور اسکی تثبیت

از

جناب خواجہ غلام گوہر علی خان متعلم بی - اے

میں مضمون کے شروع کرنے کے قبل مناسب سمجھتا ہوں کہ قدرت کی بے پایاں نعمتوں کا شکریہ ادا کروں کہ اس نے ہمارے آرام و آسایش کے لئے طرح طرح کی چیزیں وافر مقدار میں مہیا کردی ہیں -

ہم دیکھتے ہیں کہ زمین جو ہمارے لئے مختلف قسم کے اناج پھل پھول پیدا کرتی ہے اس کی ایک خاص حد یا مقدار ہوتی ہے - اگر اس سے زیادہ مقدار میں حاصل کرنا ہو تو دوسرے ذریعے اختیار کرنے پڑتے ہیں - جوں جوں زمانہ گذرتا گیا انسانی آبادی اور ضروریات زندگی میں اضافہ ہوتا گیا اور زمین کی طبعی پیداوار ان کے لئے ناکافی ثابت ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے بڑی کاوشوں و جانفشانی کے بعد بعض ایسی چیزیں یا مرکبات معلوم کئے جن کو زمین میں ملانے پر اس میں پیدایش و نمو کی طاقت زیادہ بڑھ گئی - مگر وہ ان مرکبات کی ماہیت سے واقف نہ ہو سکے اور نہ مصنوعی طور پر ان کو تیار کرنے پر قادر ہوے - حال حال میں عالمان یورپ نے اس میدان میں قدم رکھا اور بڑی محنت و کوشش کے بعد ان کی ماہیت اور ان کے عمل سے وقفیت حاصل کی - یہ بات بڑی حیرت و تعجب کی ہے کہ جو چیز زمین میں جان ڈالتی ہو اور انسان کے لئے غذا جیسی ضروری شئے بہم پہونچاتی ہو وہی دوسری طرف انسانی قتل و غارتگری میں کام آتی ہے - کیونکہ حیوانی اور نباتی زندگی کے لئے نائٹروجن بہت ضروری ہے اور اسی نائٹروجن کا بہت سے دھماکوں و آتش گیر مادوں میں بہت دخل ہے -

ھے، فرد بشر جانتا ھے کہ زمین کو عمدہ سے عمدہ بنانے کے لئے بعض خاص شیاء استعمال کی جاتی ھیں۔ ان خاص اشیا کو جو اس مقصد کے لئے استعمال ھوتی ھیں ”کھاد“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ھے۔ کھاد مختلف قسم کی ھوتی ھے مگر ان تمام میں نائٹروجن کا ھونا ضروری ھے خواہ وہ کسی شکل میں اور کسی عنصر سے ملی ھوئی ھو۔ اور درختوں پر ان کا عمل ایک ھی ھوتا ھے۔

متمدن ممالک مثلاً یورپ، انگلستان، امریکہ وغیرہ میں کھاد کے طور پر پوٹاسیم نائٹریٹ (Potassium nitrate) سوڈیم نائٹریٹ (Sodium nitra'e) اور بعض امونیم نمک استعمال کئے جاتے ھیں ان تمام کا عمل یہی ھوتا ھے کہ یہ اپنی نائٹروجن درختوں کو دیکر انکو سرسبز شاداب رکھتے ھیں۔ ھندوستان میں گھوڑے کی لید وغیرہ اور بعض درختوں کی جڑوں میں بلی وغیرہ کو مار کر ڈالتے ھیں، یہاں پر بھی یہی عمل ھوتا ھے کہ بلی وغیرہ کا مابقی زیادہ دباؤ اور تپش کے تحت تحلیل ھوکر امونیا $(NH_3)$ میں تبدیل ھوتا ھے۔ پھر یہ چند تغیرات کے ماتحت نائٹرک ترشہ میں تبدیل ھوجاتا ھے جو زمین کے اجزا سے ترکیب کھا کر نائٹریٹس (Nitrates) میں تبدیل ھوتی ھے پھر ان نائٹریٹس سے درخت نائٹروجن حاصل کرلیتے ھیں اس سے معلوم ھوا ھوگا کہ ان تمام کا عمل ایک ھی ھے اگرچہ کہ صورتیں مختلف اور پیچیدہ ھیں پوٹاسیم نائٹریٹ کھاد کے علاوہ نہایت خوفناک اور مہلک اشیاء کی تیاری میں بھی استعمال ھوتا ھے۔ جن کو دھماکو آمیزہ کہتے ھیں۔

ھر وہ شخص جو سائنس سے اور خصوصیت سے علم کیمیا ( Chemistry ) سے کچھ بھی وقفیت رکھتا ھے وہ بخوبی جانتا ھے کہ پوٹاسیم نائٹریٹ ( $KNO_3$ ) تین عنصروں یعنی پوٹاشیم، نائٹروجن اور اکسیجن پر مشتمل ھوتا ھے۔ اور اسی طرح سوڈیم نائٹریٹ

(Na,No3) بھی تین عناصر یعنی سوڈیم یا (Na,) نائٹروجن (N) اور اکسیجن (O) پر مشتمل ھے۔ ان دونوں مرکبات میں پوٹاشیم اور سوڈیم اساس ھے۔ اور اکسیجن نائٹروجن ھوا کے دو بڑے جزو ھیں۔ ذیل میں معمولی خشک ھوا میں جو گیسی اجزا شامل ھیں ان کا فیصدی تناسب درج کیا جاتا ھے اور یہ اعداد بلحاظ حجم کے ھیں۔

| گیس کا نام | فیصدی تناسب |
|---|---|
| نائٹروجن (Nitrogen) | ۷۸٫۱۱۱ |
| اکسیجن (Oxygen) | ۲۰٫۹۵۵ |
| ارگن (Argon) | ۰٫۹۳۳ |
| نیان (Neon) | ۰٫۰۰۱۵ |
| ھیلیم (Helium) | ۰٫۰۰۰۵ |
| ھائڈروجن (Hydrogen) | ٫۰۰۰۱ |
| کرپٹن (Krypton) | ۰٫۰۰۰۰۰۵ |
| زینان (Xenon) | ۰٫۰۰۰۰۰۰٦ |
| کاربن ڈائی اسائڈ (Corbon dioxide) | ۰٫۰۳ |
| اوزون (Ozone) | ۰٫۰۰۰۰٦ |

ان میں اکسیجن ھی ھماری زندگی کا باعث ھے اگر یہ نہ ھو تو حیوانی زندگی کا خاتمہ ھوجائے اور دنیا میں کوئی چیز نہ جل سکے۔ اور یہی اکسیجن ھے جو ھائڈروجن سے ترکیب کھا کر پانی پیدا کرتی ھے۔ اسی طرح تمام اجسام خواہ وہ حیوانی ھوں یا نباتی ان کی نشوء نما کے لئے نائٹروجن کا ھونا بھی بہت ضروری ھے۔

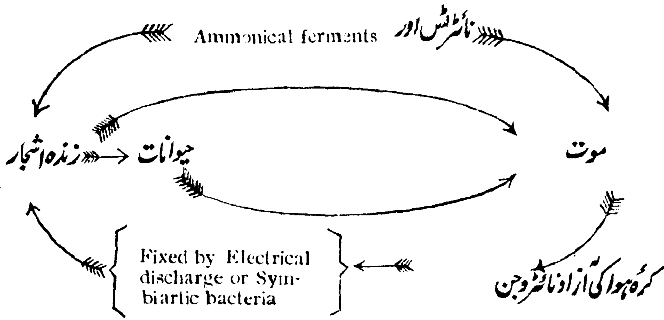
ایسے نباتی مرکبات (Organic Compounds) جن میں نائٹروجن ترکیبی حالات میں ھوتی ھے جب یہ جراسیم (Bacteria) کے توسط سے تحلیل ھوتے ھیں

و نائٹروجن کا کچھ حصہ کرہ ہوا میں مل جاتا ہے ، اور کچھ حصہ کو اشجار بالراست
لے لیتے ہیں ۔ چونکہ حیوان اس سے بالراست استفادہ نہیں اٹھا سکتے اس لئے وہ اپنی
اس کمی کو ترکاریوں کے استعمال سے پورا کرتے ہیں ۔ پھل ، پھول ، ترکاریاں جب
تحلیل ہوتی ہیں تو کچھ توانائی بھی پیدا ہوتی ہے جو اعلیٰ حیوانی زندگی کے لئے بہت
ضروری ہے ۔ توگویا اس طرح نباتات ، نامیاتی اور حیوانی زندگی کے درمیان
ایک رشتہ بنتے ہیں ۔

نباتات بھی بالعموم نائٹروجن کو کرہ ہوا سے بالراست نہیں لیتے بلکہ
نائٹریٹس میں جو نائٹروجن ہوتی ہے اس سے یہ استفادہ کرتے ہیں ۔ دیگر نباتی اشیاء جو کھاد
وغیرہ میں ہوتی ہیں وہ جراثیم (Bacteria) (اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ
درختوں کی جڑوں میں جراثیم ہوتے ہیں جو نائٹریٹس وغیرہ سے نائٹروجن کو لیکر
درخت کو دیتے ہیں ) کے حملہ یا اثر سے کچھ نائٹریٹس اور کچھ آزاد نائٹروجن میں تحلیل
ہوجاتے ہیں ۔ کرہ ہوا کی نائٹروجن کی کچھ مقدار آسمانی طوفان مثلاً برقی رووٴں کے
بہنے اور بجلی کی چمک وغیرہ سے تکسید ( کسی عنصر یا مرکب کا اکسیجن کے ساتھ ترکیب
کھانا تکسید کہلاتا ہے ) ہوکر بارش کے پانی کے ذریعہ نائٹرک ترشہ کی صورت میں
زمین پر آجاتے ہیں اور یہاں زمین پر وہ نائٹریٹس میں تبدیل ہوتے ہیں ۔ اگرچہ کہ
ان کی بہت قلیل مقدار ہوتی ہے مگر اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کن کن
طریقوں سے حیوانی اور نباتی زندگی کی پرورش کرتی ہے ۔

سنہ ۱۸۵۲ ع میں G. Ville نے دریافت کیا کہ بعض پودے مثلاً Beans
Peas , Clover , Leguminosae ایسے ہیں جو تحلیل سے زمین کو اتنی نائٹروجن دیتے ہیں
کہ ایک مرتبہ ثمر کے بارآور ہونے کے بعد بھی ان میں کافی نائٹروجن موجود ہوتی ہے ۔

سنہ ۱۸۸٦ع میں H. Hell نے بتلایا کہ بعض پودے مثلاً Leguminoa وغیرہ ایسے ہیں جن کی زندگی Bacteria کی وجہ سے ہے اور یہ Bacteria جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے درختون کی جڑون میں ہوتے ہیں یہ کہاد یا کرہ ہوا سے نائٹروجن کو لیکر درخت یا پودے کو اس سے استفادہ کا موقعہ دیتے ہیں۔ غرض یہ کہ نائٹروجن کا ہماری زندگی اور موت کے ساتھ ہمیشہ کا تعلق ہے۔ جیسا کہ ذیل کی شکل سے ظاہر ہوتا ہے۔




حسب بالا تغیر کو الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ نائٹروجن کا جوجوہر (Atom) اج ہرے بھرے شاداب و نازک پودے میں ہوگا وہ کل ممکن ہے کہ حیوانی غذا بنجائے اور پھر بعد ازان حیوانی فضلہ سے نکل کر کرہ ہوا کا رخ کرے اور یہان بجلی و برق کی کرشمہ سازیون کی وجہ سے تکسید (اکسیجن سے ملکر) ہوکر اکسائڈز میں تبدیل ہوجائے اور پھر بارش (پانی) کے قطرون پر سوار ہوکر زمین پر پہنچے اور کہاد ہوکر نباتات کی غذا بنکر ان کو تر و تازگی بخشے۔ یہ تغیر نہ معلوم کب سے جاری ہے اور کب تک جاری رہیگا۔

دوسری طرف یہ حالت ہے کہ کرہ ہوا کی نائٹروجن اور امونیا (کرہ ہوا میں بہت قلیل مقدار میں امونیا کے شائبے پائے جاتے ہیں) کی تکسید سے نائٹروجن کے اکسائڈز پیدا ہوتے ہیں اور یہ نائٹرک ترشہ میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ زمین پر

پهونچکر سوڈیم ، پوٹاشیم نمکوں کو نائٹریٹس میں تبدیل کر دیتے هیں ۔ اس کے قبل بیان کیا جا چکا هے که سوڈیم نائٹریٹ اگر زمین کو قوت نمو بخشتا هے تو دوسری طرف پوٹاشیم نائٹریٹ خلق خدا کا خون بہانے میں کام آتا هے ۔ چنانچه نپولین اعظم کے زمانه کی ایك جنگ میں فرانسیسی پوٹاشیم نائٹریٹ کے کافی طور پر دستیاب نه هونے پر بہت پریشان هوے تھے کیونکه ان کے پاس انسانی خون بہانے کا ذخیره ختم هو گیا تھا ۔ حال کی وه خوفناك جنگ جو جنگ عظیم کے نام سے موسوم کی جاتی هے سنه ۱۹۱۷ ع کے قبل هی ختم هو جاتی اگر اهل جرمنی آتش گیر اور دهما کو اشیاء بنانے کیلئے نائٹروجن کو دوسرے طریقوں سے حاصل نه کئے هوتے ۔

ذیل میں نائٹروجن کو اس کے مرکبات میں تبدیل کر کے یا قدرتی مرکب سے جو صنعتی پیمانه پر حاصل کیا جاتا هے درج کئے جاتے هیں ۔

۱ کوئله کی کشید فارق کے دوران میں بہت سی امونیا ضمنا حاصل هوتی هے ۔

۲ ملك چلی (Chili) کے گرم اور بے آب علاقوں میں پوٹاشیم نائٹریٹ وسیع پیمانه پر پایا جاتا هے ۔ حساب لگایا گیا هے که ایك وسیع قطعه زمین هے جس میں تقریبا (۳۵۰) ملین ٹن (Caliche) هے جن میں (۵۱) فیصد پوٹاشیم نائٹریٹ هوتا هے ۔ سنه ۱۹۰۹ ع میں چلی کی حکومت نے ایك کمیشن بٹھایا تھا جس کی رپورٹ سے معلوم هوتا هے که سنه ۱۹۱۲ ع میں (۲-۳) ملین ٹن کے قریب سوڈیم نائٹریٹ نکالا گیا اس سے یه نتیجه نکل سکتا هے اگر برامد کی یهی حالت رهے تو ایك صدی کے اندر اندر پوٹاسیم نائٹریٹ کا ذخیره یہاں ختم هو جائیگا ۔

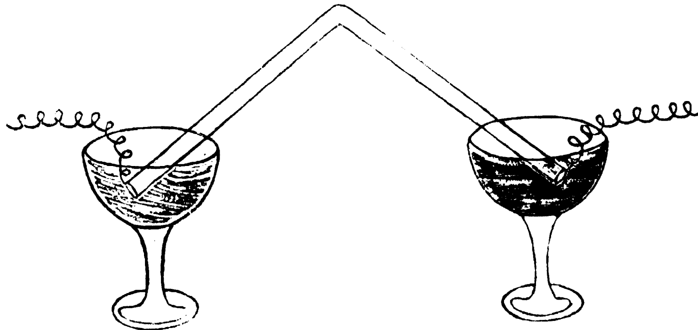
نائٹریٹ گیہوں وغیره کی کاشت کے لئے بہت استعمال هوتا هے ۔ قدرتی ماخذ کو ختم هوتا دیکھکر یورپ میں کوششیں کی گئیں اور کی جا رهی هیں که کسی آسان طریقه سے کرۂ هوا کی نائٹروجن کی تثبیت کر سکیں جو که کھاد اور دیگر مفید کاموں میں استعمال

کی جا سکے - چنانچہ سنہ ۱۸۹۶ع میں (F. Nobbe) اور (L. Hiltner) نے تحقیقات کیں اور انہوں نے "Nitrogen fixing" کے طریقہ کو (Nitragen) کے نام سے موسوم کیا اور ان کی اس تحقیق سے بعض درختوں پر اچھے نتیجے اخذ ہوئے جب کہ (Glucose) اور (Peptones) کو اس پانی میں جس میں کہ (Nitrifying bacteria) موجود ہوتا ھے ملایا گیا۔

## ۳- کرۂ ھوا کی نائٹروجن کی تثبیت کا برقی قاعدہ

(James Priestly) نے دیکھا کہ جب ھوا میں برقی شرارے پیدا کئے جاتے ھیں تو ایك ترشہ پیدا ھوتا ھے اس نے خیال کیا کہ یہ ترشئی خواص کاربانك ترشہ کی وجہ سے ھوں گے لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد یعنی سنہ ۱۷۸۵ع میں (H. Cavendish) نے ثابت کیا کہ یہ حاصل نائٹرك ترشہ ھے اسی زمانہ میں (M. Borthelot) نے تحقیق کی کہ یہاں پر نائٹرك اکسائیڈ درمیانی حاصل ھے -

(H. Cavendish) نے تجربہ میں جو آلہ استعمال کیا تھا اس کی شکل حسب ذیل ھے :-

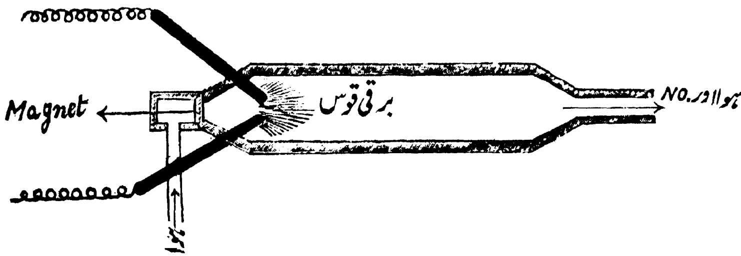


اس میں ایك خمیدہ نلی لی جاتی ھے - نلی کے دونوں کھلے سروں کو دو گلاسوں کے اندر پارہ میں ڈبو دیا جاتا ھے پھر اس نلی کے درمیانی حصہ میں متعدد برق

شرارے پیدا کئے جاتے هیں تو نائٹرك ترشه پیدا هوتا هے اس کی تشخیص سوڈیم هیڈرا کسائیڈ سے کی جاتی هے کیون که اس صورت میں سوڈیم نائٹریٹ پیدا هوتا هے۔

سنه ۱۸۹۵ع میں Z. hefebvre نے فضا میں متعدد برقی شرارےگذارے وراس عمل سے جوگیس پیدا هوئی اس کو نلی میں حل کیا تا که سوڈیم نائٹریٹ حاصل هو مگر یه قاعده زیاده کارآمد ثابت نهیں هوا۔

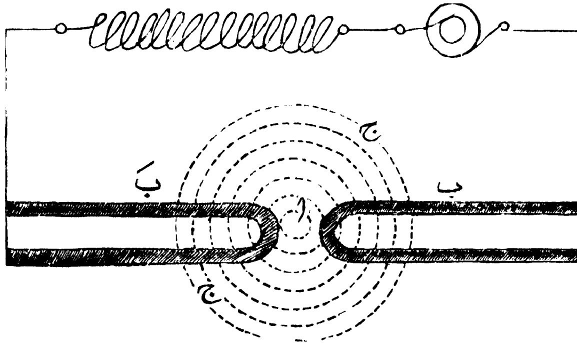
سنه ۱۹۰۲ع میں Siemens اور Halske نے هوا کو ایك ایسے کمره میں سے گذارا جس میں برقی قوس کو بهت زیاده پهیلنے کا موقعه تها تو اس عمل سے نائٹروجن کے اکسائیڈز حاصل هوئے آله کی شکل حسب ذیل هے :—




مگر سنه ۱۹۰٦ع میں اس عمل کے دوران میں جو تغیرات حادث هوئے هیں ان پر (W. Nernst) اور (F.Haber) نے روشنی ڈالی۔ چون که نائٹروجن سے معمولی تپش پر نائٹروجن کے اکسیڈائز حاصل نهیں هوتے هیں مگر بهت بلند تپشوں پر اس کے اکسائڈز حاصل هوتے هیں اور جوں جوں تپش بڑهتی جاتی هے اسی طرح پیدا هونے والے اکسائڈز کی مقدار بهی بڑهتی جاتی هے۔ چنانچه ذیل کے مشاهدات سے اس کا پته چلتا هے۔

| | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|
| تپش | ۱۸۱۱ | °۲۰۳۳ | °۲۱۹۵ | °۳۰۰۰ | °۳۲۰۰ |
| نیٹرک اکسائیڈ | ۰٫۳۷ | ۰٫۶۴ | ۰٫۹۹۷ | ۴٫۵ | ۵٫۰ |

اس طریقه سے نائٹروجن کے اکسائیڈ کو تجارتی پیمانه پر حاصل کرنے کی متعدد کوشش کی گئیں او Birkeland اور Eyde کا جو طریقه هے وه زیاده بهتر هے یه Norway میں زیاده مستعمل هے ۔ اله کی شکل اور عمل حسب ذیل هے :—




اس میں دو تانبے کی نلیاں ب ب هے جس میں سرد پانی گذرتا هے ان کے درمیان ایك بڑی طاقت کی برقی قوس پیدا کی جاتی هے ۔ جب رو کو روکا اور جاری کیا جاتا هے تو قوسین جلد جلد پیدا اور فنا هوتی هیں اور ان کے پیدا هونیکا عمل ۱/۰۰۵ سکنڈ پر هوتا رهتا هے ۔ اس طرح جلد جلد برقی قوسون کے پیدا او غائب هونے سے اتنی حرارت پیدا هوتی هے که ایك منور حلقه پیدا هوتا هے جس کو ,, برقی چاند ،، کهتے هیں ، اس کا قطر تقریبا ٦ فیٹ هوتا هے ۔ اب هوا کی روگذاری جاتی هے ۔ چونکه قوس زیاده فضا پر پهیلی هوئی هوتی هے اس لئے زیاده نائٹروجن کو تکسید هونے کا موقعه ملتا هے ۔ اس کو دباؤ کے ذریعه نکال کر ٹهنڈا کیا جاتا هے ۔ جس سے اس کی تحلیل رك جاتی هے اب °۲۰۰ پر No کو تکسیدی کمره (Oxidaton Chamber) میں پهونچایا جاتا هے جهان یه مزید اکسیجن سے ترکیب کها کر No ( نائٹرك پر اکسائیڈ ) میں تبدیل هو جاتی هے

اب اس کو ایسے پانچ جاذب کمروں مین سے گذارا جاتا ھے جہاں اس کو پانی اور دوریا چونا ملتے ھیں جذب شدہ نائٹروجن اکسائیڈز کیلسم نائٹریٹ پیدا کرنے مین اس کو تبخیر کرکے ٹھوس مرکب کو حاصل کیا جاتا ھے اور یہ ٹھوس مرکب کھاد کے نام سے بازار مین فروخت ھوتا ھے۔ Birkeland اور Eyde کے قاعدہ مین جو Norwegiam Saltpetre (کیلسم نائٹریٹ) حاصل ھوتا ھے وہ تقریباً نابیدہ ھوتا ھے۔ اس کی تجارتی اھمیت اسی سے ظاھر ھوتی ھے کہ سنہ ۱۹۰۹ع میں ۹۴۲۲ ٹن کیلسم نائٹریٹ حاصل کیا گیا اور سنہ ۱۹۱۲ع میں ۱۱۰۰۰۰ــــ۱۲۰۰۰۰۰ ٹن کے قریب تیار کیا گیا۔

۴۔ کرۂ ھوا کی نائٹروجن کو ھائڈروجن کے ساتھ تقابل کرواکر ھیڈرائیڈز میں ثبت کیا جاتا ھے وہ حسب ذیل ھے۔ اس میں یہ بتلایا گیا ھے کہ کسی خاص تپش اور دباؤ کے تحت نائٹروجن اور ھائڈروجن کے جو حجم ترکیب کھاتے ھیں ان کی کیا مقدار ھے۔

| تپش | ایک کرہ ھوا دباؤ | ۵۰ کراف ھوائیہ | ۱۰۰ کراف راتہ | ۲۰۰ کراف ھوائیہ |
|---|---|---|---|---|
| ۴۵۰° | ۰٫۲۴ | ۰٫۹ | ۲٫۱۶ | ۳٫۲۵ |
| ۵۰۰° | ۰٫۱۳ | ۰٫۷ | ۱٫۰۴ | ۱٫۶ |
| ۵۵۰° | ۰٫۰۸ | ۲٫۷ | ۶٫۹ | ۱۲٫۰ |
| ۶۰۰° | ۰٫۰۵ | ۲٫۳ | ۴٫۵ | ۸٫۲ |

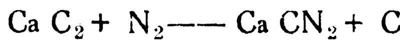
ان اعداد سے معلوم ھوتا ھے کہ تپش کم ھو اور دباؤ زیادہ ھو تو امونیا (نائٹروجن اور ھائڈروجن کے ترکیب کھانے سے جو مرکب حاصل ھوتا ھے وہ امونیا ھے) زیادہ تعداد میں حاصل ھوتی۔ ۴۵۰° تپش پر دباؤ زیادہ کرنے سے حاصل کی مقدار بھی بڑھتی جاتی ھے۔ لیکن یہ عمل سست ھوتا ھے۔ اس میں چند ترمیمیں کی گئیں ھیں جو درج ذیل ھے۔

(الف) سنہ ۱۹۰۶ع میں (F. Haber) جرمنی کے سائنس داں نے صاف کی ہوئی نائٹروجن اور ھائڈروجن گیسوں کو ۳:۱ نسبت میں لیکر ۲۰۰ کرافٹ ھوا دباؤ کے تحت ایک ایسی گرم نلی میں سے جس کی تپش ۷۰۰° ـ ۵۰۰° ھو باریک منقسم (Osmium) یا (Uranium) دھات پر سے گذارا تو امونیا حاصل ھوئی ـ

(ب) (Claude) نے اس ریزہ کو ۱۰۰۰ کرافٹ ھوائیہ دباؤ کے تحت حامل (۵۰۰° پر لوھے، پوٹاشیم اکسائڈ وغیرہ) پر سے گذارا تو ۴۰ فیصد امونیا حاصل ھوئی۔ اس صورت میں امونیا کو تابع کر لیا جاتا ھے یا زیادہ دباؤ کے تحت پانی میں جذب کر لیا جاتا ھے ۔ یہاں پر جو ھائڈروجن صرف ھوتی ھے اس کو پوش گیس (Producer Gas) سے اور نائٹروجن کو مایع ھوا کی کشید سے حاصل کیا جاتا ھے ۔ یہاں پر دھاتی لوھا حامل کے طور پر بہت کار آمد ثابت ھوتا ھے بشرطیکہ وہ گندك سے کلیۃ پاك ھو ـ

سیانمائیڈ سے

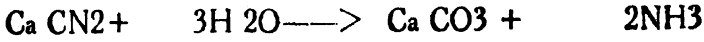
امونیا تجارتی پیمانہ پر حاصل کرنا ھو تو (Haber) کے قاعدہ کے علاوہ (Calcium Cyanamide) کی آبیدگی سے بھی حاصل کی جاتی ھے۔ یہ سنہ ۱۸۹۰ع میں (Caro) اور (Frank) نے دریافت کیا تھا۔ اس میں کیا یہ جاتا ھے کہ کیلسم کاربائڈ ($CaC_2$) کو ۱۱۰۰° تك گرم کر کے اس پر سے نائٹروجن کو گذارا جاتا ھے تو اس صورت میں (Cyanamide) کے ساتھ کچھ گرینائیٹ بھی ھوتا ھے ـ



$$Ca\ C_2 + N_2 —— Ca\ CN_2 + C$$

اس میں ٹھنڈا پانی ملا کر غیر تبدیل شدہ $Ca\ C_2$ کو جدا کر لیا جاتا ھے ـ

اب اگر اس کو پانی کے ساتھ تعامل کروائیں اور تھوڑا سا کلورائیڈ یا فلورائیڈ موجود ھو تو ۲۰۰° پر تعامل سرعت کے ساتھ ھوتا ھے ورنہ تعامل سست ھوتا ھے ـ


Ca CN2+ 3H 2O—–> Ca CO3 + 2NH3

(امونیا) (کیلسم کارپوینٹ) (پانی) (کیلسم سینا مائیڈ)

اگر Calaum Cyanamide پر سے ۱۸۰° پر بھاپ کو ۹ کراف ھوا کے تحت گذارا جائے تو تحلیل بہت جلد ھوتی ھے ۔

پہلے بیان کیا جا چکا ھے کہ کیلسم کاربائیڈ پر سے جب نائیٹروجن کو گذارا جاتا ھے تو Ca CN 2 کے ساتھ ساتھ گرینائیٹ بھی حاصل ھوتی ھے جس کی وجہ سے حاصل کا رنگ سیاہ ھوتا ھے ۔ اس سیاہ سفوف کو تر کیا جاتا ھے تاکہ وہ غیر تبدیل شدہ کیلسم کاربائیڈ کی تحلیل کردے اور اس کو ایسے Autsclaves میں آبیدہ کیا جاتا ھے جس میں ٦ ٹن پانی اور ۳ ٹن Cganamide ھوتا ھے ۔ اور بھاپ کو ۳ کراف ھوا دباؤ کے تحت گذارا جاتا ھے اگر یہاں کچھ Acatylene پیدا ھو جائے تو اس کو جدا کرلیا جاتا ھے ۔ پھر بھاپ کے دباؤ کو تقریبا گیارہ کراف ھوا اور تپش کو ۱۸۰° تک بڑھا کر مونیا حاصل کی جاتی ھے ۔

*

# بار گراں !

(ٹالسٹائی)

مترجمہ جناب خلیل الرحمن صاحب ایم - ایس - سی (عثمانیہ)

اٹلی و فرانس کی سرحد کے قریب بحیرۂ متوسط کے ساحل پر موناکو نامی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ کئی ایک گاؤں اس ملک سے زیادہ آبادی رکھنے کا فخر کرسکتے ہیں کیونکہ گنتی کے سات ہزار نفوس یہاں آباد ہیں۔ اگر جملہ زمین باشندوں پر تقسیم کی جائے تو ہر ایک کے حصے میں مشکل سے ایک ایکڑ آئیگا۔ لیکن اس ننھی ریاست کا ایک بادشاہ ہے۔ اسکا ایک محل ہے۔ درباری ہیں۔ وزراء، بشپ، جنرل، اور فوج ہے۔

فوج جملہ ساٹھ سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ دوسرے ممالک کیطرح یہاں بھی ٹیکس لیا جاتا ہے۔ تمباکو، شراب اور دیگر منشیات پر ٹیکس ہے۔ یہاں کے باشندے بھی اور ممالک کے باشندوں کیطرح شراب نوشی اور تمباکو نوشی کرتے ہیں۔ لیکن انکی تعداد اسقدر قلیل ہے کہ اگر بادشاہ کو آمدنی کے خاص ذرائع نہ ہوتے تو اسکے لئے محل۔ درباریوں اور احکام کے مصارف برداشت کرنا نہایت دشوار ہوتا۔ آمدنی کا یہ خاص ذریعہ ایک قمار خانہ ہے۔ جہاں لوگ پانسہ کھیلتے ہیں۔ لوگ خواہ جیتیں یا ہاریں ہر بازی کا ایک فیصدی حصہ قمار خانے کے مالک کو ملتا ہے۔ اور یہ اپنے منافع کا ایک کثیر حصہ بادشاہ کو دیتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تمام یورپ میں اس قسم کا یہی ایک قمار خانہ ہے۔ جرمنی کے رئیس بھی اس قسم کے قمار خانے رکھا کرتے تھے لیکن چند سال ہوئے انکو اٹھوا دیا گیا۔ قمار خانے تباہی کا باعث ہوتے ہیں۔ ایک شخص انمیں جا کر قسمت آزمائی کرتا ہے، اپنی جملہ نقدی ہار دیتا ہے۔ اسکے بعد اس رقم

کو بھی بازی میں لگا دیتا ہے جو اسکی نہیں ہوتی۔ بالاخر جب یہ بھی ہار دیتا ہے تو پریشان ہوکر خود کشی کر لیتا ہے۔ اسیوجہ سے جرمنی کے باشندوں نے اپنے رؤسا کو اسطرح روپیہ پیدا کرنیسے منع کر دیا۔ لیکن موناکو کے بادشاہ کو کون روک سکتا تھا! اس کار و بار کا اب بھی ٹھیکےدار ہے۔

آجکل ہر شخص جوا کھیلنے کے لئے موناکو جاتا ہے۔ کسی کی ہار جیت سے بادشاہ کی مستقل آمدنی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ ''حلال کی کمائی سے محل نہیں بنتا''۔ خود موناکو کا بادشاہ محسوس کرتا ہے کہ یہ کار و بار برا ہے۔ لیکن، کیا کرے؟ اسکو شاہانہ طریقے سے رہنا ضروری ہے! شراب اور تمباکو کے محاصل بھی تو برے ہیں! اسطرح وہ حکومت کر کے دولت جمع کرتا ہے۔ اسکے دربار بھی ایسے ھی پر شوکت ہوتے ہیں جیسے کہ ایک بادشاہ کے ہونے چاہیئیں۔ دوسرے بادشاہوں کیطرح اسکی تاجپوشی کا بھی دربار ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کرتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ معاف کرتا ہے۔ مجلس وزراء، تعزیرات، عدالت سب کچھ ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہ سب چھوٹے پیمانے پر ہیں۔

چند سال ہوئے اس بادشاہ کی ریاست میں ایک قتل کی واردات ہوئی۔ اس ریاست کے باشندے امن پسند ہیں۔ انکے ملک میں اس قسم کا واقعہ کبھی نہیں ہوا تھا۔ تمام عدالتی رسوم کے ساتھ مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ جج، وکیل سرکار، جیوری، وکلاء سب موجود تھے۔ خوب بحث مباحثے کے بعد ملزم کو ازروئے قانون سزائے قتل سنائی گئی۔ بعد ازاں اس حکم کو بادشاہ کےسامنے پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے اسکو منظور کرتے ہوئے لکھا ''اگر مجرم کو قتل کرنا ضروری ہے تو قتل کر دیا جائے''۔

اسکی تکمیل کے لئے ایک دقت یہ تھی کہ انکے پاس سر قلم کرنیکے لئے گیلوٹین تھی نہ کوئی جلاد۔ وزراء نے اس معاملے پر غور کرنیکے بعد یہ تصفیہ کیا کہ حکومت فرانس

سے اس بارے میں دریافت کیا جائے کہ آیا وہ گیلوٹین اور ایک ماہر جلاد فراہم کر سکتی ہے اور اگر کر سکتی ہے تو اسکے کیا مصارف ہونگے؟ خط روانہ کرنیکے ایک ہفتہ بعد جواب آیا کہ آلہ اور ماہر بھجوائے جا سکتے ہیں۔ اسکے مصارف ۱۶۰۰۰ فرانک ہونگے۔ خط بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے غور کیا ”سولہ ہزار فرانک! یہ مردود اتنی کثیر رقم کے قابل تو نہیں ہے! کیا اس سے کم خرچ میں یہ کام نہیں ہوسکتا؟ سولہ ہزار فرانک کے یہ معنی ہوئے کہ ہر شخص سے دو فرانک سے زائد ٹیکس لیا جائے۔ رعایا اسکو کبھی قبول نہیں کریگی۔ ممکن ہے فساد ہو جائے“۔

پس اس مسئلہ پر غور کرنیکے لئے مجلس طلب کی گئی جس میں تصفیہ پایا کہ اس بارے میں شاہ اٹلی سے دریافت کیا جائے۔ حکومت فرانس جمہوری حکومت ہے یہ بادشاہوں کا لحاظ نہیں کرتی۔ لیکن شاہ اٹلی رشتۂ اخوت کا لحاظ کرتے ہوئے ممکن ہے اس سے کم رقم میں یہ کام کر دیں۔ خط لکھا گیا جسکا فوری جواب وصول ہوا۔

حکومت اٹلی نے لکھا کہ اس کام کو وہ بخوشی انجام دیگی۔ اسکے مصارف بشمول اخراجات سفر ۱۲۰۰۰ فرانک ہونگے۔ یہ رقم نسبتاً کم تھی لیکن اسکی ادائی مشکل تھی بدمعاش اس رقم کے بھی قابل نہیں تھا۔ اسکے لئے بھی ۲ فرانک فی نفر ٹیکس وصول کرنا پڑتا۔ دوبارہ مجلس طلب کی گئی۔ وزراء نے اس کام کو کفایت سے سرانجام دینے کے متعلق بہت غور کیا۔ بالآخر یہ تجویز ہوئی کہ کسی سپاہی سے یہ کام لیا جائے سپہ سالار کو طلب کر کے دریافت کیا گیا ”کیا آپ مجرم کا سر قلم کرنیکے لئے کوئی سپاہی کو دے سکتے ہیں؟“۔ جنگ کے زمانے میں یہ لوگوں کو قتل کرنیسے کبھی گریز نہیں کرتے اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں صرف اسیکی مشق کرائی جاتی ہے۔ بنابریں سپہ سالار نے سپاہیوں سے اسکے متعلق دریافت کیا کہ آیا انمیں سے کوئی اس کام کو انجام دینے کے

لئے تیار ھے ؟ لیکن کسی ایک نے بھی رضامندی ظاھر نہیں کی۔ ,,نہیں،، سپاھیوں نے ھم آواز ھو کر کہا ,, ھم قتل کرنا نہیں جانتے۔ ھمیں یہ کام نہیں سکھایا گیا ھے،،۔

کیا کیا جائے ؟ دوبارہ وزراء نے اس مسئلہ پر غور کیا۔ اسکے لئے ایک کمیشن ایک کمیٹی، ھیں اور ایک ذیلی کمیٹی مقرر کی گئی اور آخر کار یہ طے پایا کہ سزائے قتل کو حبس دوام میں بدل دیا جائے ۔ اس سے باد شاہ کو اپنا رحم ظاھر کرنیکا موقع ملیگا اور ساتھہ ھی اخراجات، میں بھی کافی تخفیف ھو جائیگی۔ باد شاہ نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ لیکن اب یہ دشواری پیش آئی کہ دو آدمی حبس کے لئے کوئی مناسب قید خانہ موجود نہیں تہا۔ وقت ضرورت ایک چھوٹے حوالات میں مجرمین کو کچھ عرصے کے لئے رکھا جاتا تہا۔ لیکن اب حبس دوام کے لئے ایک مضبوط قید خانہ کی ضرورت تہی بہر حال کام چلانیکے لئے ایک موزوں مکان تلاش کر کے قاتل کو اسمیں رکھا گیا اور اسکی نگرانی کے لئے پہرہ مقرر کیا گیا۔ پہرہ داروں کا یہ کام تہا کہ قاتل کی نگرانی کریں اور اسکے لئے شاھی باورچی خانے سے کھانا پہنچا دیا کریں۔

اسطرح مہینے گزرتے گئے حتی کہ ایک سال ختم ھو گیا۔ ختم سال پر جب باد شاہ نے اپنی جمع خرچ کا حساب دیکھا تو معلوم ھوا کہ اخراجات میں ایک نئے مد کا اضافہ ھوا ھے ۔ وہ یہ کہ قیدی کی نگرانی کے لئے پہرہ اور اسکے کہانے پر سالانہ ۶۰۰ فرانک ھو رھے تہے اور پھر بد قسمتی سے قاتل نوجوان اور تندرست و توانا تہا جو ابھی پچاس سال تک زندہ رہ سکتا تہا۔ اسطرح جملہ اخراجات کا حساب لگانیسے ایک کثیر رقم ھوجاتی تہی۔ باد شاہ اسکے لئے کبھی تیار نہیں تہا۔ اس نے وزراء کو طلب کر کے کہا ,مجرم کو سزا دینے کا کوئی سستا طریقہ سونچا جائے۔ موجودہ طریقہ بہت زیر بار کرنیوالا ھے،،۔ وزراء نے آپسمیں مشورہ کیا۔ بالاخر بہت غور و فکر کے بعد ایک نے کہا ,, حضرات

میرے خیال مین پہرہ برخاست کر دیا جائے،،۔ ،، لیکن ،، دوسرے وزیر نے اعتراض کیا ،،مجرم فرار ھو جائیگا،،۔ پہلے مقرر نے جواب دیا،، فرار ھو کر کہین مر کھپ جانے دو ھماری بلا سے ،،۔ پس بادشاہ کو اس تصفیه سے مطلع کیا گیا جسکو اسنے منظور کر لیا۔ پہرا اٹہا دیا گیا۔ اب اس بات کا انتظار تہا که دیکھین کیا ھوتا ھے۔ اور ھوا یه که جب کھا نیکے وقت قیدی باھر نکل کر پہرہ دارون کو غائب پایا تو فرار ھونیکے بجائے خود اپنا کھانا لانیکے لئے شاھی باورچی خانے کی طرف روانه ھوا وھان سے کھانا لیکر جیل خانه واپس ھوا اور اپنے کمرے میں داخل ھو گیا۔ دوسرے دن بہی یہی ھوا۔ آخر کیا تدبیر اختیار کی جائے؟ وزراء نے دوبارہ اسپر غور کیا اور یه تجویز ھوئی که قیدی سے صاف صاف کہدیا جائے که وہ اسکو رکھنا نہیں چاھتے۔ پس وزیر عدالت نے مجرم کو طلب کرکے کہا ،، تم فرار کیون نہین ھو جاتے؟ تمہاری حفاظت کے لئے کوئی پہرہ نہین ھے۔ اب تم جہان چاھے جا سکتے ھو۔ بادشاہ سلامت اسکی پروا نہیں کرینگے ،،۔

،، بےشك۔ بادشاہ سلامت کو اسکی پروا نہین ھوگی ،، قیدی نے کہا ،، لیکن اب مین کہان جا سکتا ھون؟ کیا کر سکتا ھون؟ آپ نے میری نیکنامی پر دھبه لگا دیا ھے۔ لوگ مجه سے کنارہ کش رھینگے۔ اسکے علاوہ اب کام کرنیکی عادت بہی جاتی رھی۔ اپ نے میرے ساته بہت برا سلوك کیا۔ جب مجھکو قتل کی سزا دی گئی تہی تو چاھیئے تہا که اسکی تعمیل کی جاتی۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا اور میں خاموش رھا۔ اسکے بعد مجھکو حبس دوام کی سزا دیگئی اور میرا کھانا لانیکے لئے پہرہ مقرر کیا گیا۔ لیکن چند دنون بعد پہرہ اٹھا دیا گیا۔ اب مجھکو اپنا کھانا آپ لانا پڑتا ھے۔ اسپر بہی میں بالکل خاموش رھا۔ اب آپ چاھتے ھیں که مین یہان سے چلا جاؤن! یه ھرگز نہیں ھو سکتا۔ آپ جو چاھیں کر سکتے ھیں۔ میں تو نہیں جاؤنگا ،،۔

اس خلاف امید صورت حال کے پیدا ہونیسے پھر ایک مرتبہ وزراء مشورہ کے لئے جمع ہوئے۔ مجرم تو جانیسے انکار کرتا ہے اب کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ اس مسئلہ کو انہوں نے بہت دیر تک غور کیا۔ ایک صورت یہ تھی کہ مجرم کے نام کوئی وظیفہ مقرر کر دیا جائے ,, اسکے علاوہ کوئی دوسری تدبیر سمجھہ میں نہیں آتی انہوں نے بادشاہ سے عرض کیا کسی طرح اس بلائے جان سے چھٹکارا ہو جائیگا ،،۔ ۶۰۰ فرانک سالانہ وظیفہ منظور کیا گیا اور اسکی اطلاع قیدی کو دی گئی۔

,, خیر ،، قیدی نے کہا ,, اگر آپ پابندی کیساتھ دیا کریں تو مجھکو کوئی عذر نہیں صرف اسی شرط پر میں یہاں سے جانیکے لئے تیار ہوں ،،

تمام امور کا تصفیہ کرنیکے بعد قیدی وظیفہ سالانہ کا تہائی حصہ پیشگی لیکر ریاست سے باہر چلا گیا جس کے لئے ریل سے صرف پندرہ منٹ کا راستہ تہا۔ سرحد کے اس پار اس نے کچہ زمین خرید کر وہاں سکونت اختیار کرلی ہے۔ اب یہ باغبانی کرتا ہے اور خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ ہرسال پابندی سے اپنا وظیفہ لینے کے لئے موناکو جاتا ہے۔ وہاں ۲و۳ فرانک جوئے مین ہار جیت کر گھر واپس ہو جاتا ہے۔

بھلا ہوا کہ اس نے کسی ایسے ملک میں قتل نہیں کیا جہاں کسی شخص کا سر قلم کرنیکے بار گراں اور برداشت کرنیکے لئے پس و پیش نہیں کیا جاتا ہے۔

———

# چند تاریخی اسناد

از

جناب محمد غوث صاحب یم۔اے ال ال۔بی (عثمانیه)

گذشته چند سال سے مجھے جب کبھی مدراس میں مقام کرنے کا موقع ملا میں نے اپنا کچه وقت جناب مولوی حاجی عبدالرحمن صاحب که تاریخی دفتر کے معائنه اور اسکے مرتب اور مهذب کرنے میں بھی صرف کیا۔ سارے دفتر کی با قاعده ترتیب اور تهذیب کے لئے بڑے سرمایه اور بڑےوقت کی ضرورت هے۔اگر یه دفتر مرتب هوجائے تو تاریخ هندوستان که اکثر مختلف فیه امور قابل لحاظ حدتك تصفیه پاسکینگے۔

گذشته موسم گرما کا بڑا حصه بھی مدراس میں صرف هوا اور ساته هی تهذیب دفتر کا بھی کچه کام انجام پایا۔ اس مرتبه مجھے چند ایسے کاغذات دستیاب هوئے جن کا تعلق سلطنت حیدرآباد سے هے۔غفران مآب حضور نظام علی خان مرحوم حضور شجاع الملك بسالت جنگ مرحوم ،۔ نواب رکن الدوله مرحوم ،۔ اعظم الامرا نواب ارسطو جاه مرحوم ،۔ میر عالم علی مرحوم وغیره اکابر حیدرآباد که بهت سارے خطوط میری نظر سے گزرے۔ اس قدر وقت نهیں تها که سارے خطوط کا بعد ترتیب مطالعه کیا جاتا۔ توقع هے که مستقبل قریب میں یه سارے خطوط بعد ترتیب و تهذیب شایع هوجائینگے۔لیکن فی الوقت مجله عثمانیه کی اس اشاعت میں چند خطوط واسناد تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعه کے لئے پیش کئے جاتے هیں۔

---

# عنایت نامجات حضور غفران مآب
# نواب میر نظام علی خان

---

لفافه پر حسب ذیل القاب لکھنے کا التزام تھا :—

"امارت و ایالت مرتبت شہامت و بسالت منزلت عزیز القدر

عمدۃ الملک سراج الدوله انور الدین خان بہادر منصور جنگ"

یه خطاب و القاب نواب محمد علی خان والا جاہ بہادر کے لئے مستعمل تھا۔

سارے خطوط پر "نظام الملک آصف جاہ سنه ۱۱۷۵" کی "مہر خورد" ثبت ہے۔ اس زمانه کے دستور کے موافق لفافوں پر مہر کی گئی ہے۔ سارے عنایت نامجات "دستخط خاص" سے مزین ہیں۔ جیسے که اس وقت قاعدہ تھا دستخط کے لئے کوئی خاص نشان اختیار کرلیا جاتا تھا، ان عنایت ناموں میں بھی "دستخط خاص" کے لئے ایک مخصوص نشان اختیار فرمایا گیا ہے۔ کاغذ افشاں زدہ ہے۔

(۱) عنایت نامه جو ۱۹ ذی حجه سنه ۱۱۷۵ ھ کو ترچنا پلی میں وصول ہوا۔

تقریبا ہر عنایت نامه کا آغاز "ہوالکریم" سے ہے جو سر نامه پر تحریر ہے اس کے نیچے وہی القاب درج ہوئے ہیں جو لفافه پر مرقوم ہیں۔

"نظیر بر خلوص عقیدت وصدق ارادت آں عزیز القدر که به تخصیص دریں جناب متحقق است از سابق مقرر فرمودہ ایم که جواب سوال امورات آں ملک بے وساطت آں عزیز القدر بمیاں نیاید۔ لهذا بعضے

مراتب به شهامت و بسالت مرتبت سمو المکان موالات نشان ، راج راجندر راجه تهلداس بهادر ........ ارشاد گشته مفصل از نوشته ، راجه مشار الیه و سیادت پناه میر مرتضی خان مطلع شده در آنچه صلاح دولت باشد بعمل باید آورد ـ زیاده چه نوشته شود ،،

---

(۲) عنایت نامه جو ۲۱ شعبان سنه ۱۱۷۶ھ کو قلعه ایلوره میں وصول ہوا ـ

بعد القاب معمولی ـ

،، حسین علی خان مبلغ خطیر بقایائے سرکار راجمندری وغیره بذمه خود باقی داشته بچناپٹن (مدراس) رفته در پناه انگریز نشسته می خواست ، کسان انگریز همراه آورده در سرکار راجمندری وغیره خلل انداز شود چنانچه شهامت و جلادت دستگاه جارجی پیکٹ گورندور چناپٹن (جارج پیکٹ گورنر مدراس) بر طبق حکم حضور ، مقتضائے صدق ارادت ، دست ازاین خیال برداشته ، و سرکارات مذکور از حضور بمیر بدیع الزمان خان تفویض یافته اما کسان مشار الیه بعلت وجه اخراجات شبندی در راجمندری برائے دخل تعرض دارند و این معنی از شیوه راستی و درستی انگریزان خیلے مستبعد نمود اگر خان مذکور قرار اخراجات کرده باشد از و تقاضا نمایند ـ بے دست آویز حضور مزاحمت در تعاقه سرکار چه لازم ـ لهذا گورندور را باید فهمایند که به نائب بندر مچهلی پٹن تاکید بنویسند که کسان خود را برداشته به هیچ وجه مزاهم نشوند و به همه وجوه ممد و معاون عامل منصوب باشند ـ زیاده چه نوشته شود ایام بکام باد ـ

(۳) ـ عنایت نامه جو ۸ شوال سنه ۱۱۷۸ھ کو میراخوی خان کی وساطت سے مدراس میں وصول ہوا

بعد القاب معمولی ـ

,, حقوق عنایات و احسان ہائے متکاثرہ نواب صاحب قبلہ مغفرت مآب (حضور آصف جاہ اول) کہ بحال والد ماجدان شہامت مرتبت در جمیع اوقات و احوال بر سبیل تزاید و ترقی جاوہ آرائے شہود بودہ بر وضیع و شریف عالمیان مستحق و مستغنی از بینہ و برہان است و ہم چنین خلوص عقیدت و صفائے طویت و ثبات و قدم بر صراط مستقیم انقیاد و صداقت و تقدیم خدمات و جان بازیہا تادم واپسین ازان طرف متیقن و متفق جمہور انام و بے نیاز از شرح و بیان بودہ ـ نظر بر تحقق این مراتب و مصداق کلام صدق انجام الولد سر لابیہ چشم داشت ظہور اخلاص و اطاعت و پاس مراسم دولت خواہی و فدویت ازان بسالت منزلت بر سبیل توارث و تفاعف بودہ و بفضل الٰہی ہست لیکن در چشم بصیرت اصحاب عقل و ذکا و خود قرائن و آثار رادر اثبات مضمرات باطن دخل کلی یست..... ازان خلف الصدق دودمان صدق و صفا درین امر واجب الادا توقف مفرط بمعرض وقوع آمدہ حتی موجب تامل خاطر حق مظاہر ما کہ پیوستہ در صدر بذل عنایات روزافزون است گشتہ خصوص درین وقت کہ موکب جاہ و جلال با افواج بحر امواج باین قرب مسافت رسیدہ عدم ارسال عرایض و اطلاع روداد و حقایق تعجب بر تعجب افزودہ لہذا برائے اظہار بعضے مراتب و دریافت مکنونات باطن عقیدت مواطن ان خلافت منزلت خان سیادت دعوایی نشان

سید رضوی خان را روانه چوب کرده شد که با بلاغ مدارج تفصلات
بیکران بیان فواید و منافع تقدیم اخلاص و خدمات نمایان پردازند مجدد
گلشن صدق فدویت و دولت خواهی را آب و رنگ طراوت انضارت
بر روے کار آید احسن کما احسن الله الیک

نواب والا جاہ بہادر نے اسکے جواب میں جو عریضہ ارسال کیا اس کا
صاف شدہ مسودہ ایک افشانی مطلا کاغذ پر موجود ہے اسکے سرنامہ پر درج ہے کہ

بیستم شہر شوال سنه ۱۱۷۸ھ وقت شب مہر شدہ حوالہ میر مرتضی خان
شد۔ بہ ہمین مضمون بنام رکن الدولہ و شیر جنگ بہادر نوشتہ جات
روانہ گردید

مد کھینچ کر عریضہ اسطرح لکھا گیا ہے:—

"عنایت نامہ تفضل آمود ..... این کہ حقوق عنایات متکاثرہ حضرت
مغفرت ماب بر والد...... در جمیع اوقات برسبیل تزاید جلوہ آرائے شہود
بودہ دھم چنین خلوص عقیدت و صفای طویت و تقدیم خدمات وجان بازی ھا
تا دم واپسین از طرف والد احقر بظہور رسیدہ ونظر بمصداق کلام صدق
انجام الولد سرّ لابیہ چشم داشت مراسم دولت خواہی و فدویت از بندہ
برسبیل توارث مرتضاعف بورہ و ھستلا کن در چشم بصیرت اصحاب عقل
وذکا ازین عقیدتمند درین امر واجب الادا توقف مفرط بوقوع آمدہ خصوص
درین وقت کہ موکب جاہ وجلال بانت قریب نزول فرمودہ عدم رسیدن
عرایض واطلاع روداد وحقایق تعجب بر تعجب افزود ھشتم شہر المکرم
بمصحابت سید رضوی خان ورود فرمودہ معزز و ممتاز ساخت و مضمون

عنایت مشحون و ارشاد محوله زبانی خان مشارالیه مفصل در یافت۔ احقر را بہمه وجوه حتی المقدور سعی افزونی دولت خواهی آن جناب که مقصود دائمی است متحقق و سابق از همه پیشتر بار سال عرایض ............. باحضور عطوفت گنجور پیشد از چند ماه که محور قصور گردیده و جهش مشروحاً از اظہار خان موی الیه بعرض خواهد در آید۔ بنا بر معرض داشتن حقایق ارشاد شده احوال این جا این است که فرانسیس از روی اسناد دکن همه ملك را از کنار کشنا گرفته تا دریائے شور متصرف بود و کسانیکه تفضل بسیار بر او کردند اگر فائده خود و حرص و افر قوم مذکور ملاحظه می نمودند این قدر توجه بماش نمی فرمودند دراستخلاص این ملك از دست فرانسیس و گرفتن انتقام حضرت نواب شهید (۱) و والد شهید رحمته الله علیهما محنت و مشقتے کها زهفتده سال بر خود اختیار کرده وکرورها را از انگریزان و دیگر ساهو کاران وغیره قرض سودی کشیده صرف این کار نموده احتیاج به تشریح ندارد و هنوز وجه سود هم ادا نشده تا باصل چه رسد و ملك از اتفاق محاربات دوام هفتده ساله بالکل ویران ....... گردیده مع هذا قلعے که تحصیل می شود باداى سود قرض خواهان و اخرجات سربندی همراهی کفایت نمی کند تدارك مهام معروضه و قوام دین اسلام درین ملك از پیشگا تفضلات توقع انواع تحسین و افرین بخاطر نیا زماثر درشت و دار دلا کن بر طبق تمنائے احقر نوازش و عطیات ان جناب در نظر مردم ظاهر بین جلوه پذیر نشد مفصل زبانی سید رضوی خان و میر مرتضی خان

(۱) حضور ناصر جنگ شهید ۱۲

بعرض خواهد در آمد۔ الحال که تفصلات بے غایات ملازمان بر احوال خود بدستور سابق یقین خاطر شده آینده به ترسیل عرایض و پا سراری مزاج مبارك مرتکب اهمال نخواهد گردید۔ مراتب اعتقاد و رسوخیت و دولت خواهی بنده انقدر است که ملازمان جناب در درستی و درستی ان هیچ شك و شبه بخاطر مبارك نخواهند داشت ـ امیدوار فضل وکرم که ازحدور عنایت نامجات سرمایه اندوزاعزاز و مباهات باشد۔ زیاده مدارب افتاب دولت واقبال تابان باد،،۔

---

۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ کو نواب والا جاه بهادر کے حسب خواهش ان فرزند کے نام سند التمغا عنایت هوی اس کے متعلق بعض ضروری کی اشاعت دلچسپی سے خالی نہیں ۔ پہلے اصلی سند کی مقدمه نقل ذیل میں نقل کی جاتی هے ـ

،، نقل سند التمغا بمهر و دستخط نواب آصف جاه نظام الدوله بهادر و مهر ۰۰۰۰۰۰رکن الدوله مدارالمهام ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰

قرار بتاریخ ۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ آنکه دریں ولا تمامی تعلقه کرناٹك بالاگهاٹ که از ابتدا متعلقه حیدر آباد بود واز بالاگهاٹ که از ابتدا بابت صوبه داری بیجاپور متعلق بود جداد متفرق هست معه کرناٹك پایان گهاٹ در و بست ازکنار دریائے کشنا تا آخر سرحد ملك ملیوار معه دیوانی و بخشی گری و میر اتشی پایان گهاٹ و بالاگهاٹ مذکور۔ و همگی تلاغ وجاگیرداران و زمینداران و پالکاران وتعلقه داران وانعام داران و روزینه داران وغیره بهمه جهت در وبست بلاشرط و شراکت ومداخلت آمدے در وجه انعاالتمغ امارت و ایالت حشمت و شرکت منزلت عمدة الامرا معین الملك اسدالدوله

حسین علی خان ذو الفقار جنگ مطابق فرمان والا شان و سند نواب آصف الدوله صلابت جنگ مرحوم حسب الضمن مقرر و مفوض گشته باید که فرزندان برادران کامگار جانشین این جانب و کرام و متصدیان نظامت دکن متکفلان معاملات نو دکهن حال و استقبال مطابق فرمان و سند این جانب ابدا موبدا در استقرار و استمرار این مراتب کوشیده تعلقات مذبوره بتصرف امارت و ایالت مرتبت مسطور نسلا بعد نسل و بطنا بعد بطن واگزارند و از حوادم تغیر و تبدل معون و محروس دانسته بعلت پیشکش صوبه داری و فوجداری و جمیع ابواب ما بو جهات و اخرجات وغیره بوجهی من انوجوه مزاحم و منصرض نشوند و توقیر کل تکالیف دیوانی وغیره معاف و مرفوع القلم شمارند درین بابت تاکید اکید دانسته هر سال سند مجدد نه طلبند و از مراتب مرقوم الصدر اصلا تخلف و انحراف نو زند تحریر فی التاریخ ــــ،،

واضع هو که یه سند سنه $\frac{۱۷۶۷ع}{۱۱۸۱ھ}$ کی جنگ ترناوی کے بعد عطا هوئی هے جو پہلی جنگ میسور شمار هوتی هے اس جنگ میں نواب حیدر علی خان۔ حضور نظام علی خان اور مرهٹے ایک طرف اور انگریز یا نواب محمد علی خان والاجاه ایک طرف تھے جنگ میں نواب حیدر علی خان کو شکست هوئی تھی۔ بعد از ان نواب والا جاه بهادر کی کوشش سے حضور نظام علی خان اور انگریزوں میں صلح و آشتی طے پائی اور معاهده مرتب هوا۔ اس معاهده کی بناء پر سند مذکور عطا هوئی۔

معلوم هوتا هے که نواب والا جاه بهادر نے اصلی سند آنے کے بعد سارے کاغذات متعلقه کی مصدقه نقلیں بهی حاصل کیں چنانچه اس وقت جو نقل مصدقه پیش نظر هے اس پر ،، مطابق است ،، مرقوم هے اور ،، خادم شرع شریف قاضی

حمیدالدین احمد ،، کی ،، مہر کلاں ،، ثبت ھے ۔ پشت پر ،، ضمن ،، یا ،، کیفیت ،، درج ھے جس کے آخیر میں ،، شرح دستخط خاص سند بد ھند ،، کے الفاظ موجود ھیں اطراف کاغذ پر ،، داخل سیاھیه حضور شد ،، ،، نقل بد فتر استسفا رسید ،، ،، مہر رکن الدوله بتاریخ ۲۳ شوال سنه ۱۱۸۱ ھ ثبت شد ،، نقل بدفتر دیوانی رسید ،، مرقوم ھے ۔

واضح ھوکہ خود دفتر والاجاھی میں اس سندکا مسودہ تیار ھوا بعد ازاں اسکو گورنر مدراس کے پاس راوانه کیا گیا ۔ مسٹر رچرڈ بوچر اس زمانه میں گورنر تھے ۔ ان کے ملاحظه کے لئے جو مسودہ راوانه کیا گیا اس پر درج ھے که

،، نقل این مسودہ حواله رکن الدوله بھادر
روبروے صاحب زادہ پنجم شوال سنه ۱۱۸۱ ھ ،،

اس مسودے میں ملک کا نام صرف اس قدر درج ھے ۔
تمائی تعلقه کرناٹك پائین گھاٹ و بالا گھاٹ ،،

لیکن گورنر مدراس نے اس کو پسند نہیں کیا اور اس حصه مسودہ کو قلمزد کر کے خود ایك علیحدہ کاغذ پر اس کا مسودہ کیا ھے ۔ اس کاغذ پر جو ساختۂ ولایت ھے ۔ حسب ذیل عبارت درج ھے ۔

،، کاغذ انگریزی نوشته گورنر مسٹر بوچر ،، گورنر مدراس کا مسودہ یوں ھے ۔

،، کرناٹك بالا گھاٹ که از ابتدا متعلقه
حیدرآباد بود واز بالا گھاٹ که از
ابتدا بابت صوبه داری بچھا ھوا متعلق

بود جداد متفریق هست معه کرناٹك
پایان گھاٹ در وبست تا اخیر سرحد
ملك مليوار ،،

اس فارسی عبارت کے نیچے اس کا انگریزی میں ترجمه بھی کیا گیا ھے۔ دفتر والا جاهی میں اس جدید مسوده کے لحاظ سے پھر ایك علحده مسوده صاف کیا گیا اور اسکو پھر مع سابقه کاغذات کے گورنر مدراس کے پاس روانه کیا گیا ھے۔ چنانچه اس پر مسٹر اسٹریسی نے اپنے دستخط کئے ھیں۔مسٹر اسٹریسی کمپنی کے دفتر میں مترجم تھے۔مسٹر اسٹریسی نے اس کاغذ پر کالی سیاھی سے لکھا ھے که۔

،، استریسی دید ،،

البته اس مسوده میں پھر ،، از کنار دریائے کشنا ،، کی اصلاح کی گئی ھے۔اور گورنر مدراس کے سابقه مسوده میں بھی ان الفاظ کا اضافه سیاھی سے کر دیا گیا ھے ان مراحل کے طے ھونے کے بعد مسوده نواب رکن الدوله بہادر کے سپرد کیا گیا جو مدراس آئے تھے۔وه اسکو لیکر لشکرگاه آصفی میں واپس آئے اور مراتب ضروری کی تکمیل کے بعد سند مرتب اور نواب والا جاه کی خدمت میں روانه کی گئی۔

واضح هو که گورنر مدراس نے اپنے بھائی جیمس بوچر کو لشکر آصفی میں وکیل بنا کر روانه کیا تھا۔ساته هی مسٹر اسٹریسی اور مسٹر ،، لتیم ،، بھی روانه کئے گئے تھے۔ان لوگوں نے روشن الدوله اعتبارالملك بہادر کرنل جان کال کی وساطت سے حصول سند کے متعلق جو عرائض نواب والا جاه بہادر کو روانه کئے ھیں وه یه ھیں۔

# خط کرنل کال

(الف) لفافہ پر حسب ذیل مہر ثبت ہیں۔

"روشن الدولہ اعتبار الملک بہادر جان کال"، خط کے سرنامہ پر "ہی"، درج ہیں۔

"نواب صاحب قبلہ خدائگان فیاض عالم و عالمیان مدظلہ العالی الحال خط مسٹر جیمس بوچر مرقوم شانزدھم معہ انگریزی رسید دران نوشتہ‌اند کہ کاغذ یکہ آن خدایگان مستدعی شدہ‌بودند از ناظم دکھن حاصل نمودہ و توقع دارد کہ در معدودد الایام امورات دیگرہم منقع خواھد شد چراکہ اوشان از ناظم مذکور بہ تقید گفتند درصورتیکہ ایشان بہ چستی زیادہ کارگزار نہ بودہ واعتماد بر انگریزان ندارند فوج مایان فی الفور بطرف کرناٹك روانہ خواھد شد چنانچہ ناظم مذکور درجواب این کلات جواب از مہربانی دادند تفصیل ان فردا بہ نیازمند خواھد رسیدان وقت بآن خدایگان اطلاع دادہ خواھد شد خطوط شکربنام نایی کہ ملفوف نیازنامہ فرستادہ شد ازان خوش خبربان فیض رسان دریافت خواھد گردید زیادہ چہ نماید۔

(ب) خط جیمس بوچر۔

نواب صاحب خدایگان فیاض زمان امیدگاہ نیازمندان سمہ اللہ تعالی۔

دو قطعہ عنایت نامہ مکرمت سمامہ مرقوم ھفتم ذیحجہ سنہ ۱۱۸۰ ھ وصول فرحت‌شمول آوردہ مسرور ساخت مطابق مسودہ نواب صاحب

سند التمغا حاصل گردید چنانچه در خدمت گزراینده خواهد شد باقی کوایف بعد هوس ملازمت که به فضل الهی در عرصه قلیل الایام میر خواهد شد اظهار خدمت گرامی مرتبت نموده خواهد گشت تا حصول ملاقات فرحت ایات پیوسته به ترقیم نوازش نامجات مسرور می فرموده باشند زیاده چه بر طراز و آفتاب عمر و دولت مدام تابان درخشان باد هرب العباد،،

لفافه خط پر جو مهر ثبت هے وه محو هو گئی هے ـ

(ج) خط مسٹر اسٹریسی ـ

اس خط کی عبارت بعینه وهی هے جو مسٹر جمس بوچر کی هے لفافه هر حسب ذیل مهر ثبت هے ـ

،، مستر یدورد اسٹریسی مترجم ـ

فارسی کمپنی انگلیس سنه ۱۷٦۷ عیسوی ،، ـ

(د) خط ،، مستر یستم ۰۰۰۰۰۰ ،،

نواب صاحب قبله فیض رسان عالمیان امیدگاه جهانپناه دام الله ظلال اقباله ـ

آداب تسلیمات وکورنشات ۰۰۰۰۰ بجا

آورده بموقف عرض باریابان بارگاه خلایق پناه می رساند قبل ازین دو قطعه عرایض نیاز متضمن لحاوی این نواحی یکے از معرفت نتاننند و دویم معحوب مردم ۰۰۰۰۰۰۰۰ ارسال حضور فیض گنجور ساخته یقین که بفضل الهی از روی ان کماهی کوایف منظور نظر کرم مظهر خواهد شد ـ دی روز که تاریخ شانزدهم ذی حجه بود مستر جیمس بوچر و مستر استریسی و نیازمند نزد رکن الدوله بهادر رفته بودیم بنابر نوشته دادن اسناد التمغا مطابق مسودهائے بندگان عالی که در تحویل مستر استریسی است ذکر کرداد کار در پیش آمد آنچه رکن الدوله فرمودند که اسناد مذ کو رفردا تیار کرداینده محاذیم

امید در جناب الهی است که زود حاصل خواهد شد زیاده جمیعت و دولت وصحت وعافیت فتح و نصرت حاضر رکاب باد ـ

مکرر معرض آنکه امروز بوقت شام سند التمغا بکرم الهی رسید چنانچه مستر استریسی در عرضداشت خود ملفوف آن جناب کرده اند از نظر مبارك خواهد گزشت یکے از دولت خواهان صادق محمد خواهنده قادری آداب تسلیمات وکورنشات بجامی آرد،،۔

——— ———

نواب الدوله جاه بهادر نے سند حاصل هونے کے بعد ایك سو ایك اشرفی نذرگزرانی اور عرضداشت روانه کیا جوجواب صادرهوا وہ یه هے ـ

,, خط مرسله با یکصد و یك اشرفی نذر و ورود سند التمغا رسید و مضامین ارادت صداقت مقرون که مثمر برکات روزافزون است واسطهٔ وفور وسرور خاطرگردید بفضل الهی ازیں خاندان دولت نشان عمو ما در حق ادنا واعلی ورائی تفضلات وپرورش بعرصهٔ ظهوررنیا مده اگر احیاناً کسے بمقتضائے شامت ایام عار نمك حرامی بر خود اختیار کرده جاده پیمائے دشت ادبار گشته بسزائے کردار ناهنجار رسیده مجدداً باندك زمان رهگزائے اطاعت شده به تخصیص آن عزیز القدر که از ابتد ناهج مناهج دولت خواهی و خواهان صولت و سطوت سرکار اند هرآئینه مستوجب عنایات اخص الخواص حضور هستند ـ هر قدر عنایات مبذول شود محل استعجاب نیست ـ حاضر بودن جمعیت خود و انگریزان باطراف نیابر پاداش خیره سرآن درجه استحسان یافت ـ بعون افضال ایزدی از بدو تنظیم و تنسیق مهام ریاست تا الی الان احدے از مفسدان

طاقت اطراف از حکم حضور نیافته بر صراط مستقیم فدویت و اطاعت استقامت ورزیده و درین دلا معاملت پیشکش حیدر علی خان بهادر نموے که انفعال شده و پسر بهادر مذکور حصول ملازمت نموده رخصت شده از بس اشکار محتاج تشریح نیست و بفضله هم عنان نصرت و اقبال معاودت بعمل آمد۔ الحال مهیا و متفریق داشتن جمعیت با ماکن مرقومه ضرور نیست۔ معروض مقدمات هلاح دولت را موجب استرخاۓ حضور دانسته به هیچ وجه مقصر نباید بود زیاده چه نوشته شود،،

# ترک شعر

## از

جناب محمد حبیب اللہ صاحب رشدی یم۔ اے (عثمانیہ)

---

بند کرتاهوں دکان اے قدرداں اب الوداع
تیری خاطر میں سمندر سے گہر لایا کیا

تیرا احسان مانتاهوں اے میرے جوهرشناس
لیکن اس جوهر فروشی سے مجھے کیا مل گیا

عالم امکاں میں لاکھوں هیں بیابان و چمن
ایک کٹھن وادی هے اب اس سے گزرنا هے مجھے

کیاجواب آخر میں دونگا کل کسی کے روبرو
ڈگمگا جائے اگر اس راہ میں پاؤں میرا

دست و پا شل هوگئے هیں گم هوئی پرواز روح
بار دنیا سر پر هے سیر چمن کا ذکر کیا

عرش آزاری پہ کی پرواز تو اب تک بہت
خارزار پائے بندی میں بھی هے جانا مجھے

اب تلک میں خود رها عالم پہ اک بار گراں
اب اجازت دے کہ کردوں اسکا کفارہ ادا

هو رها هوں آشنائے لذت تلخاب دهر
اب مزہ جاتا رہا شیرینئی گفتار کا

اب تو وہ همدم نهیں شاعر نهیں رشدی نهیں
خودغرض، دنیاطلب، مزدور بننا هے مجھے

# جواب قدرداں

از

جناب عمر بن صالح صاحب وفاؔ

---

کس طرح روکوں تجھے جاتے ہوئے اے غمگسار
ہوں تہی دامن تیری مشکل میں کام اونگا کیا
میرا احسان ؟ کاش میں احسان ہی کر سکتا کوئی
کاش تیری گوہر افشانی کا دے سکتا صلہ

عالم امکاں میں بے شک ھے بیابان و چمن
کون سی وادی ھے اب جس سے گذرنا ھے تجھے

وہ کٹھن وادی اگر ھے خار زار رنگ و بو
وہ کٹھن وادی اگر ھے امتحان گاہ وفاؔ
وہ کٹھن وادی اگر ھے منظر صبر و سکون
وہ کٹھن وادی اگر ھے منزل راہ وفا

پھر تو اے وارفتۂ غم جا آسے بھی دیکھہ آ
گر بہ ہر عنوان بگڑ ھی کر سنورنا ھے تجھے

تجھکو کیا فکر جواب اخرت ھے میرے دوست
پرسش ایزد کے قابل ھی نہیں عصیاں تیرا

تیری صورت سے نمایاں ہے تیری مجبوریاں
اس کو اپنے جبر کا ہوگا نہ کچھ احساس کیا؟

اے میں قرباں یہ طلسم زندگی کے دام ہیں
ان سے بچ کر ہی ابھی پرواز کرنا ہے تجھے

فرض کرتا ہوں کہ تو عالم پہ ہے بار گراں
مان لیتا ہوں کہ تجھ پر تنگ ہے ارض و سما
کیا مگر یہ کج ادا عالم نہیں ہے تجھ پر بار
کیا تیری تقریب میں اس کا نہیں ہے مشورہ

زندگی تیری ہے گویا موجۂ آب رواں
ہر نفس سو بار مٹ مٹ کر ابھرنا ہے تجھے

ساز ہستی کی خموشی کیوں نہ ہو غم آفریں
تشنۂ مضراب ہوں پھر چھیڑ دے مجھکو ذرا
پھر گہر ہائے مضامیں سے میرے داماں کو بھر
پھر میری خاطر سمندر سے در نایاب لا

تو وہی شاعر، وہی ہمدم، وہی رشدی ہے تو
تابش فکر سخن ہی سے نکھرنا ہے تجھے

*

# ولی کی غیر مطبوعہ غزل

از

جناب خواجہ محمد احمد صاحب یم۔ اے۔ ال ال، بی (عثمانیہ)

---

مجھ سے مکرمی مولوی سید حبیب اللہ شاہ صاحب نے ارشاد فرمایا تھا کہ موصوف کے پاس کلیات ولی کا جو قلمی نسخہ ہے اسکے متعلق اپنی رائے کا اظہار کروں۔

اس نسخے پر اسکی تحریر کی تاریخ اور کاتب کا نام نہیں ہے اس وجہ سے اس کا صحیح اندازہ لگانا کہ یہ کب ضبط تحریر میں آیا نہایت دشوار ہے، لیکن کاغذ۔ سیاھی اور رسم الخط سے ظاھر ھوتا ہے کہ یہ نسخہ کم از کم ایک صدی قبل لکھا گیا ہے۔ کاغذ پر از افشاں ہے اور جدول طلائی ہے، خط صاف اور اچھا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں دوسرے نسخوں سے اس کا مقابلہ کرنے پر زیادہ وقت صرف نہ کر سکا۔ انجمن ترقی اردو کی طبع کی ھوئی کلیات سے اس کا میں نے سرسری مقابلہ کیا اور دو باتیں میں نے اس میں خاص پائیں ایک تو یہ کہ بعض جگہ پر اس میں ان نسخوں سے جو کلیات کی طباعت کے وقت پیش نظر تھے جو اختلاف ہے اس سے وہ اشعار جو ابھی تک بے معنی خیال کئے جا سکتے تھے اب با معنی ھو جاتے ھیں اور اکثر اشعار میں معنی کی خوبی اور حسن پیدا ھو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس نسخے میں چند وہ اشعار یا غزلیں نہیں ملتیں جو مطبوعہ کلیات میں ھیں۔ لیکن اس میں اکثر ایسے اشعار ھیں جو صرف ایک یا دو نسخوں میں ملتے ھیں۔ مجھے اس میں ایک پوری غزل ایسی ملی ہے جس کا ولی کے مطبوعہ کلام میں پتہ نہیں اس غزل کے چند اشعار حسب ذیل ھیں۔

سیر ہے باغ ہے نظارہ ہے　　سبزہ ہے لالہ ہے ہزارا ہے

کان میں یار کی دروبالی　　مہر ہے ماہ ہے ستارہ ہے

بات کے بیچ ساز مطرب کی　　بین ہے چنگ ہے دوتارا ہے

نگہ شوخ و قاتل خونخوار　　سیف ہے، بانک ہے، دودھارا ہے

آتو آغوش میں حجاب نہ کر　　گوشہ ہے رات ہے اندھارا ہے

ملک دل کی خرابی کرتے کون　　شاہ ہے فوج ہے نقارا ہے

مجکون ہردم ولی فراق مستی　　آہ ہے نالہ ہے پکارا ہے

کیا عجب ہے کہ جن حضرات کو ولی کے کلام سے زیادہ دلچسپی ہے اس قسم کے مزید اشعار یا غزلیں ملجائیں۔ اور ان سے ولی کے کلام پر مزید روشنی پڑ سکے۔

# "خود اپنے کو نہ پہچانا مگر نا آشنا بنکر"

از

سرتاج

پریشان خاطری دیکھی خم زلف دوتا بن کر — کبھی آسودگی پائی دل بے مدعا بن کر

کبھی سینہ زمین کا چیر کر تحت الثریٰ پہونچا — کبھی اوجِ فلک دیکھا یتیموں کی دعا بن کر

بخالت کی حقیقت آئینہ صورت نظر آئی — جو دل کا حوصلہ دیکھا کبھی دست عطا بن کر

حق و باطل کو دیکھا بن کے محور وئے دھریت — کبھی مندر میں بت اور گاہ مسجد میں خدا بن کر

حیات و موت کی ہر طرح کیں آگاھیاں حاصل — کبھی خضر بیاباں گاہ تصویر قضا بن کر

وجود ھستی معبود کی شان بقا دیکھی — چمن زار جہاں میں موج سیلاب فنا بن کر

زباں سوسن کی ھو کر سن لیا افسانۂ ھستی — زوال حسن دیکھا چشم نرگس کی ادا بن کر

زلیخا کی نظر سے حسن کی تاثیر پہچانی — ضمیر پاک دامن جسم یوسف کی قبا بن کر

حقیقت جزو و کل کی دیکھ لی سچے خیالوں میں — خود اپنے کو نہ پہچانا مگر نا آشنا بن کر

# سراب حیات

## از

جناب محمد بدر الدین خان صاحب شکیب بی۔ اے (عثمانیہ)

زندگانی ! آہ ! یہ مایوسیاں
ایک دل اور سیکڑوں مجبوریاں

عشق کی دنیا ہے اک رنگین خواب
اک طلسم آرزو حسن و شباب

ہے ہوس اک بحر نا پیدا کنار
اور مسرت گل پہ شبنم کی بہار

لالہ و گل موت کی تفسیر ہیں
اور بہارین خود خزان تعمیر ہیں

ذرہ ذرہ دھر کا نا پائدار
زندگانی کا نہیں کچھ اعتبار

عالم حسرت میں جاں خاموش ہے
بیکسی سے زیست ہم آغوش ہے

ہاں ! مسرت دھر میں نا پید ہے
زندگی موہوم سی امید ہے

# خطبہ صدارت

## از

جناب اغا جعفر حسن صاحب متعلم ال ال۔ بی صدر انجمن اتحاد

جناب صدر و معزز حاضرین

میں زیر بار احسان ہوں کہ آپ نے مجھ ایسے حقیر کو اس منصب جلیل سے سر فراز فرما کر اپنی ذرہ نوازی کا ثبوت دیا ۔ نا چیز ھدیہ شکر قبول فرمائے۔ خدا میرے کمزور بازوں میں قوت دے کہ ان توقعات کو پایہ تکمیل تك پہونچا سکوں جو آپ نے مجھے انجمن اتحاد کی خدمت گذاری کے لئے منتخب فرماتے وقت وابستہ کی ہونگی ۔

حضرات ! انجمن اتحاد کے مقاصد اور اسکی اہمیت کا ذکر ایك رسم کہنہ ہے لیکن جب میں اس افسوس ناك حقیقت کا احساس کرتا ہوں کہ ہماری انجمن تا حال وہ توجہ اور وابستگی حاصل نہیں کرسکی ، جسکی وہ مستحق ہے تو میں مجبور ہو جاتا ہوں کہ ایك مرتبہ پھر اس داستان پارنیہ کو آپ کے گوش گذار کروں ۔

یہ امر محتاج بیان نہیں ہے کہ کسی جامعہ کا نصاب تعلیم خواہ کیسا ھی اعلیٰ کیوں نہ ھو زندگی کے ہر پہلو پر حاوی نہیں ھو سکتا ۔ انجمن اتحاد ھی ایسا ادارہ ہے جو فطری ذوق آگاھی کی تکمیل کے لئے میدان مہیا کرتا ہے ۔ یہاں آپ آزادی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرسکتے ھیں ۔ کچھ اپنی کہئیے گا کچھ دوسروںکی سنئے گا اس طرح نہ صرف کرید اور تجسس کی عادت پیدا ہوگی جو حیات انسانی کا نصب العین ہے بلکہ جب آپ عملی دنیا میں قدم رکھینگے تو آپ

ایك اهل الرائے اور جامع انسان هو نگے اور یه اپنی قدر و قیمت میں درسگا هون کی اعلی ترین عملی اسناد سے بهی زیاده بلند هے۔ انجمن اتحاد کا وجود اس امر کا ثبوت هے که همارا اخلاقی عملی اور تمدنی ارتقا کا احساس زنده هے اسمیں شك نهیں که هماری مادر علمیه نے ملکی زبان کو ذریعه تعلیم قرار دیکر خوابیده هندوستان کے آگے ایك قابل تقلید مثال پیش کی اور به آواز بلند پکار دیا۔

کرمك نادان طواف شمع سے آزاد هو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد هو

همارا نصاب تعلیم اعلیٰ هے، همارے امتحانات کا معیار بلند هے لیکن میں افسوس کے ساته اعتراف کرنے پر مجبور هوں که هم وه وقعت و منزلت اور هر دلعزیزی حاصل نه کرسکے جو اس اصلاح یافته یونیورسٹی کی بنیاد قائم کرنے والونکے پیش نظر تهی۔ ممکن هے اسکی وجه یه هے که مست و مدهوش هندوستان هنوز بیدار نهیں هوا هے، ممکن هے اسکی وجه یه هے که بیگانه نگاهیں انصاف کرنے کے لئے تیار نهیں هیں لیکن اسکی ایك وجه یه بهی هے که همنے درسی تعلیم کے علاوه طالب علمانه زندگی کے دیگر مشاغل میں کماحقه دلچسپی نهیں لی۔ یهی سبب هے که جب هم عملی زندگی کے متلاطم سمندر میں قدم رکهتے هیں تو همیں محسوس هوتا هے که ساحل تك پهونچانے کے لئے همارے ٹهوس فنی معلومات کافی نهیں هیں۔ برادران کلیه انجمن اتحاد آپ کی خدمت گزاری کے لئے موجود هے، آیئے اپنی کمزوریوں کو دور کیجئے اپنی قوتوں کو ترقی دیجئے تاکه جب آپ کالج کی چاردیواری سے باهر نکلیں تو دنیا کے سامنے مکمل انسان کا نمونه لیکر جائیں۔

اس زمانه میں جب که هندوستان فرقه واری احساسات کے افسوس ناك دور سے گذر رها هے۔ میں آپ کی خدمت میں ایك پیام عمل پیش کرنا چاهتا هوں۔ وه یه

یه ھے کہ ان مانع ترقی امتیازات کو دور کر کے ایک روح ایک قالب بن جائے اور انصاف کو اپنا نصب العین قرار دیجئے ، انصاف اپنی ذات کے ساتھہ اور انصاف غیر ذات کے ساتھہ اگر آپ نے انصاف کو اپنا زلایحۂ عمل قرار دے لیا تو پھر تمام امتیازات خود بخود اٹھہ جائنگے - من و تو کی بحث باقی ھی نہیں رھیگی - اس وقت باھم فرق کرنا ھی مشکل ھوگا کہ کون کیا ھے - اس کیفیت کا ھمارے ملک کے مایہ ناز شاعر علامہ اقبال نے بڑی خوبی سے نقشہ کھینچا ھے -

زاھد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ھے مسلمان ھوں میں

اپنے دل میں اس تمام احترام اور ارادت کو برقرار رکھتے ھوئے جس کے علامہ اقبال ایک بلند پایہ شاعر ھونے کی حیثیت سے مستحق ھیں ، میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرونگا کہ مساوات اور اخوت کی منزل تک پھونچنے کے لئے ھمیں ایک درجہ اور طے کرنا ھے جب کہ زاھد تنگ نظر مجھے کافر نہیں بلکہ زاھد سمجھیگا اور کافر تنگ نظر مجھے مسلمان نہیں بلکہ کافر خیال کریگا - اصل تو یوں ھے کہ زاھد و کافر کی تقسیم میں خود دوئی کی بو ھے - ھمیں نہ زاھد کی ضرورت ھے ، نہ کافر سے سروکار ھم اپنے دامن میں زندگی کا شرارہ رکھنے والے ھندوستانی چاھتے ھیں جن کے قلب ذات الٰہی اور اس کے شعائر و آثار و قعت و منزلت سے معمور ھوں - ھم کاش فرقہ واری اور جماعتی لحاظات کی تنگ نظری سے بلند ھو کر بنی نوع انسان سے محض انسان کی حیثیت سے محبت کرنا سیکھیں !-

برادران کلیہ یہ آپ کا کام ھے کہ کامل اتحاد کا نمونہ بنکر دنیا کو پیام اخوت دیجئے - اب میں بہت مختصر الفاظ میں انجمن کی آئندہ زندگی کے متعلق کچھ اصلاحی تجاویز پیش کرونگا - میری پہلی تجویز جلسوں کے اوقات سے متعلق ھے - فی الحال

انجمن کے تمام علمی جلسے سہ پہر میں منعقد کئے جاتے ھیں جبکہ ارکان انجمن دن بھر کی کالج کی تھکن کے باعث آرام کے جویاں ہوتے ھیں اور اکثر جلسوں میں شریک ہونے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ اصل یہ ھے کہ اسوقت ان میں وہ شگفتگی اور مستعدی باقی نہیں رھتی کہ مباحثوں میں دلچسپی کے ساتھ شریک ہو سکیں۔ حضرات یونیورسٹی کی ذاتی عمارات کی عدم موجودگی سے جو تباہ کن اثر طلبا کی معاشرتی اور علمی زندگی پر پڑ رھا ھے وہ محتاج بیان نہیں ھے۔ خدا کا شکر ھے کہ ھمارے رعایا نواز بادشاہ سلطان العلوم نواب میر عثمان علیخان بہادر خلداللہ ملکہ و سلطنتہ کی فیاض منشی کی بدولت یونیورسٹی ٹون کی اسکیم کروڑھا روپیہ کے صرف سے میدان عمل میں لائی جاری ھے ہم نہایت بے چینی کے ساتھ اس مبارک گھڑی کا انتظار کر رھے ھیں جبکہ جامعہ عثمانیہ اپنی علمی بستی میں ہوگی جہاں کی ہر ہر شے طلباء کی معاشرتی اور علمی زندگی کی ضروریات کے مطابق مہیا کی گئی ہوگی۔ حضرات میں یقین دلاتا ہوں کہ طلبائے جامعہ اس مبارک گھڑی کے بے انتہا مشتاق ھیں جو جامعہ عثمانیہ کی زندگی میں ارتقا کے ایک عظیم الشان دور کی پیغامبر ثابت ہوگی۔ اسکی تعمیر و تکمیل میں ایک ایک روز کا وقفہ اور تاخیر ھمارے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتی ھے۔ ھماری علمی ترقیوں کے راستہ میں صدھا مشکلات حائل ھیں ھماری معاشرت یکساں نہیں ھے، ھمارے خیالات کا مرکز ایک نہیں ھے، سیکڑوں غیر علمی کششیں ھمارے خیالات کو اپنی طرف منتقل کرنے کے لئے موجود ھیں۔

میں چاھتا ہوں کہ اپنی آواز کو جناب صدر آپ کے ذریعہ سے تمام ارباب متعلقہ تک پہونچاؤں۔

بہرحال یونیورسٹی ٹون کی تعمیر کے بعد جب کہ جامعہ عثمانیہ اقامتی جامعہ ہوجائیگی یہ وقت کا سوال خود بخود مٹ جائیگا، لیکن فی الوقت ارکان انجمن کی سہولت کے مدنظر

مناسب ہوگا کہ اوقات درس میں سے ہر ہفتہ کچھ وقت انجمن کے جلسوں کے لئے دیا جائے۔ میرے دانست میں ۱۱ بجے سے ایک بجے تک کا وقت بہت موزوں ہوگا میں انتہائی مسرت کے ساتھ اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ جب سال گذشتہ یہ تحریک پیش ہوئی تو ہمارے علم دوست اور طلبا نواز صدر عالیجناب عبدالرحمن خان صاحب نے اظہار ہمدردی فرمایا میں پھر نہایت ادب کے ساتھ ایک مرتبہ صاحب ممدوح کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں اور مجھے یقیں ہے کہ ہمارے شفیق صدر جن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ علمی مشاغل میں طلبا کی ہر امکانی طور پر حوصلہ افزائی فرمائیں اس خاص دلچسپی کا جو آپ کو انجمن اتحاد کی اصلاح و ترقی سے ہے ایک اور ثبوت مہیا کرنے میں تامل نہیں فرمائیگے۔

جناب صدر میں اس موقع پر اعترف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جس طرح آپ نے ہر موقع پر ہماری اعانت فرما کر اپنی شفقت اور ایثار کا اظہار فرمایا اس کی خوشگوار یاد ہمارے قلوب پر ہمیشہ منقوش رہیگی۔ ہم آئندہ بھی آپ سے ہر جائز امداد کی توقع رکھتے ہیں۔ آپ کی طلبا نوازیوں کی ایک تازہ مثال اس وقت میری پیش نظر ہے۔ آپ ہی کی انتھک کوشش تھی کہ ہمارے جامعہ کے ہر دلعزیز طالب علم شفیع احمد صاحب کو پیراکی کی مشق کے لئے ریاست کی جانب سے یورپین اسکالرشپ عطا کیا گیا۔ اسی سلسلہ میں اور جن جن صاحبوں نے دلچسپی کا اظہار فرمایا ان کی عنایت و مہربانی کو طلبائے جامعہ کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔

اسی سلسلہ میں جناب صدر میری ایک عرض اور ہے یعنی یہ کہ یونیورسٹی ٹاؤن کی تعمیر تک جسطرح یونیورسٹی کی دیگر عمارات کے لئے کثیر ماھانہ مصارف برداشت کئے جاتے ہیں وہاں اتنا اور کیا جائے کہ انجمن اتحاد کے لئے جو طلبا کی جسمانی دماغی، علمی

اور معاشرتی اصلاح و ترقی کی اہم ترین آلہ کار ہے کوئی موزوں عمارت مہیا کر دیجائے۔ انجمن کو اپنے جلسے منعقد کرنے اور دیگر فرائض انجام دینے میں جو دشواریاں در پیش ہیں وہ جناب صدر آپ سے مخفی نہیں ہیں۔

اب میرا روئے سخن اپنے شفیق اساتذہ کی جانب ہے۔ احسان ناشناسی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ آپ نے ہمارے انجمن کے ساتھ بے توجہی برتی۔ میں خوب واقف ہوں کہ جب کبھی کار پردازان انجمن آپ کی خدمت میں اعانت کی درخواست لیکر گئے اکثر اصحاب جنکے اسمائے گرامی میں بخوف طوالت ظاہر نہیں کر رہا ہوں نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہو گئے۔ کابینۂ جدید آپ سے روزافزوں الطاف و عنایات کی توقع رکھتی ہے۔ ہمارے جلسوں میں آپ کی موجودگی موجب حوصلہ افزائی بعد آپ کے مفید و قیمتی خیالات ہمارے لئے شمع ہدایات ہونگے۔

حضرات محل مسرت ہے کہ انجمن اتحاد منازل ارتقا سے گزر رہی ہے۔ گزشتہ دو سال کے عرصہ میں کئی کامیاب علمی سیاحتیں کی گئیں۔ یوم کلیہ بھی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا جسکے تمام ہی خواہان کلیہ متمنی تھے۔ لیکن برادران کلیہ برا نہ مانئے اگر میں عرض کروں کہ ہمارے علمی جلسوں کی تعداد کچھ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ ہم انجمن اتحاد کے اہم ترین مقصد سے قابل افسوس بے توجہی برت رہے ہیں۔

بخون آلودہ دست و تیغ غازی ماندہ بے تحسین
تو اول زیب اسپ و زینت برگستواں بینی

برادران کلیہ انجمن آپ کے واسطے ہر ممکن سہولت بہم پہونچانے کے لئے تیار ہے۔ ہم اگر خدمت گزاری میں کوتاھی کریں تو سزوارسرزنش، لیکن آپ بھی اسے اپنا فریضہ تصور فرما کر انجمن کے ہر جلسہ میں شرکت کیجئے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تقاریر میں حصہ لیجئے۔

جناب وقار لکھنوی ہندوستانیوں میں جدوجہد کے فقدان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

یہ طوق بےحسی کس واسطے پہنا ہے گردن میں
کبھی کچھ نا امیدی تو نہیں غفلت کے دامن میں

جہاں تک میںنے حالات کا مطالعہ کیا ہے یہ شعر بہت کچھ ہمارے حسب حال ہے ۔ اکثر ارکان انجمن محض اس بنا پر تقاریر کرنے سے گریز کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ذہن میں مقرر کی قابلیت و علمیت کے متعلق ایک غلط تصور قائم کر رکھا ہے ۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ اسٹیج پر قدم رکھنے کے لئے ہر شخص کو لائڈ جارج اور شاستری ہونا چاہیئے ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ اپنے آپ کو اس تصوری معیار پر پورا اترتے نہیں دیکھتے تو انجمن کے علمی جلسوں سے بے تعلقی ہی کو اپنے لئے پسند کر لیتے ہیں ۔

برادران کلیہ اول تو یہ بجائے خود ایک غلط خیال ہے کہ مقرر کو اسٹیج پر آنے کے لئے کچھ غیر معمولی صفات سے متصف ہونا چاہئے ۔ انسانی تخیل کی انتہائی یکسانیت کے باوجود ہر شخص کو فطرت نے کچھ امتیازی خصوصیات سے سرفراز کیا ہے جو اسے بقیہ گروہ انسانی سے علحدہ کر دیتی ہیں اور یہی انفرادیت سوسائٹی کی ہئیت اجتماعی کی اصلاح و ترقی کا ہیولی ہے ۔ یہ آفرینش کا بڑا دلچسپ راز ہے کہ کائنات کی گونا گونی کے باوجود ہر جگہ ایک وحدت موجود ہے اور پھر یہی مختلف اور متضاد عناصر سمٹ کر ایک مرکز پر قائم ہوجاتے ہیں اور ایک ہی رشتہ میں شیزازہ بند ہوجاتے ہیں ۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشرہ کا ہر رکن خواہ وہ کسی طبقہ اور کسی حیثیت کا ہو منظر عام پر آکر اپنی انفرادیت سے معاشرہ (سوسائٹی) کی ترکیب و تشکیل میں مفید ثابت ہوسکتا ہے ۔ قطع نظر اسکے انجمن اتحاد تو اس لئے ہے کہ آپ کے واسطے مشق و مہارت کا موقع مہیا کرے ۔ یہ درحقیقت درس

و تحصیل کا زمانہ ھے جسے آپ نے امتحان تصور فرما لیا ھے امتحان کا وقت بعد میں ائیگا اور اگر اپ نے اس وقت سے فائدہ اٹھایا اور مشق و کوشش جاری رکھی تو بہت ممکن ھے کہ جب عملی زندگی کا وہ دور آئے جسے میں نے امتحان کا زمانہ کہا ھے تو آپ دنیا کے اعلیٰ ترین مقررین میں سے ثابت ہوں ۔

ایک اور تجویز میں آپکی خدمت میں یہ پیش کرنا چاھتا ھوں کہ میری رائے میں مختلف جامعات کے طلباء کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور واقفیت ہونے کے مواقع فراہم کرنا بہت ضروری ھے ۔ افسوس ھے کہ طلباء کا کوئی آل انڈیا ادارہ موجود نہیں ہے اس لئے انمیں ھم خیالی خلوص و اتحاد کی روح پیدا کرنے کے لئے بہترین طریقہ یہ ھوسکتا ھے کہ ”یوم کلیہ“ کے سلسلہ میں ایک آل انڈیا بین الاقوامی تقریری مقابلہ ترتیب دیا جائے جسمیں تمام جامعات کے نمائندے حصہ لیں ۔ یہ نہ صرف معاشرتی اعتبار سے مفید ہوگا بلکہ اس سے تقریر میں مہارت حاصل کرنے کی بھی تحریک و ترغیب ہوگی ۔

میری آخری تجویز علمی سیاحتوں سے متعلق ھے۔ علمی سیاحتوں کی ھمیں جس درجہ ضرورت ھے اور یہ ھماری کردار کی تعمیر اور ھمارے تجربہ کی توسیع میں جو اہم حیثیت رکھتی ھیں وہ محتاج بیان نہیں ۔ مقام مسرت ھے کہ طلبائے کلیہ میں علمی سیاحتوں کی اھمیت کا احساس بدرجہ اتم موجود ھے جیسا کہ گذشتہ کئی مواقع پر ظاھر ھوا ۔ لیکن مصارف کا سوال ایسا ھے کہ ھم میں اکثر باوجود خواھش و کوشش کے ان سیاحتوں میں میں حصہ نہیں لے سکتے ۔ یہ امر مخفی نہیں ھے کہ اعلیٰ تعلیم کی توسیع و اشاعت کے مدنظر ھمارے جامعہ میں ھر پہلو سے اس امر کا بطور خاص لحاظ رکھا گیا ھے کہ ھر طبقہ اور ھر حیثیت کے طلبا اعلیٰ تعلیم کی دولت سے مستفید ھوسکیں ۔ ان حالات میں ھم توقع نہیں کرسکتے کہ خواہ طلباء میں کیسی ھی آمنگیں کیوں نہ موجود ھوں علمی سیاحتوں میں بغیر سرکاری امداد کے

طلباء کی زیادہ تعداد حصہ لے سکیگی۔ میں یہاں پھر انتہائی مسرت کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ ہمارے شفیق صدر عالی جناب عبدالرحمن خان صاحب نے جو طلباء کی جائز ضروریات سے کبھی غافل نہیں رہے اس مسئلہ میں اعانت فرمانے کا وعدہ کرلیا ہے۔ لہذا میں اس موقع سے فائدہ اٹھاکر جناب صدر سے درخواست کرتا ہوں کہ اس سال اپنے وعدہ کو عملی جامہ پہناکر انجمن اتحاد کی ترقی میں معاون ہوں۔

حضرات اب میں اس دعا کے بعد آپ سے رخصت ہونگا کہ خدا ہمارے بادشاہ عدل پرست نواب میر عثمان علی خان بہادر خلداللہ ملکہ و سلطنتہ کی عمر و اقبال میں ترقی عطا فرمائے اور ان کے ظل عاطفت میں جامعہ عثمانیہ جو اس علم نواز دور فرمانروائی کی مہتم بالشان یادگار ہے دن دونی رات چوگنی ترقی کرے۔

"این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

# کلیہ کی خبریں

**صدارت کلیہ** ہمارے سابق صدر کلیہ مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب بی۔ایس سی (لندن) اپنی اصلی خدمت پر نظام کالج واپس تشریف لے گئے اور صدارت کا جائزہ پروفیسر قاضی محمد حسین صاحب ام۔ اے۔ نے حاصل فرمایا۔

**اساتذہ جامعہ عثمانیہ** مولوی حبیب الرحمن صاحب ام۔ اے۔ ال۔ ال بی مددگار پروفیسر معاشیات نے لندن یونیورسٹی سے بی۔ ایس۔ سی (آنرز) کی ڈگری امتیازی طریقے سے حاصل کی ہے۔

مولوی ابن حسن صاحب مددگار پروفیسر تاریخ کا مقالہ تحقیقاتی پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے اکسفورڈ یونیورسٹی نے منظور کیا۔

**ایچ۔ سی ایس کا مقابلہ** اس سال امتحان ایچ۔ سی۔ ایس کے مقابلہ میں کلیہ کے حسب ذیل طالب علموں نے کامیابی حاصل کی۔

جناب زین العابدین صاحب متعلم ال، ال۔ بی (آبتدائی)۔

جناب چندر کانت راؤ صاحب گوٹسے متعلم ال، ال۔ بی (آبتدائی)۔

# کالج کے دن

از

جناب عزیز احمد صاحب

متعلم، کلیۂ جامعہ عثمانیہ

مجیب........... کالج کا ایک طالبعلم

صالح............. مجیب کا ہم جماعت اور دوست

وحید............. انکا ہم جماعت اور دوست

وسیم.............. ،،

ظفر............... انکا ہم جماعت اور دوست

حسام الدین...... ،،

سیموئیل جیفرے... کالج کا ایک طالب علم

ابراھیم............ ایک دیہاتی طالب علم

شمش الدین........ ،، دو برس کے بعد

اور کئی طالب علم

پرنسپل...........

ادریسی صاحب...... پروفیسر اردو

حبیب احمد........... مجیب کے والد

چپراسی وغیرہ

آرورا (Aurora)...... کالج کی ایک متعلمہ

لارا (Laura)........... اسکی ہم جماعت سہیلی

اور لڑکیاں

# پہلا ایکٹ

## پہلا منظر

[کلاس کا ایک کمرہ نظر آرہا ہے۔نشستیں جمی ہوئی ہیں۔ انکے آگے کچھ فاصلے پر طالبات کی نشستیں ہیں۔ اسکے بعد چبوترے پر کرسی اور میز ہے۔کلاس بھر میں صرف ایک طالبعلم نظر آرہا ہے جو آڈی ٹوریم کی قریب ترین نشستوں میں سے ایک پر بیٹھا ہوا ہے۔اسکے چہرے سے انتہائی سنجیدگی اور متانت کا اظہار ہورہا ہے وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہا ہے اسکا نام مجیب ہے۔ پردہ اٹھنے کے دس سکنڈ بعد ایک اور طالبعلم داخل ہوتا ہے جسکی صورت سے بے فکری اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اسکا نام ظفر ہے۔]

ظفر :— اجی آداب عرض ہے قبلہ سب سے پہلے آپ ہی موجود [ہاتھ ملاکر کرسی کے بازو پر بیٹھ جاتا ہے اور نشست پر کتابیں رکھدیتا ہے۔ مجیب کے چہرے پر یکساں تبسم رہتا ہے] معلوم ہوتا ہے گھر سے وائرلیس پر تشریف لائے ہیں۔

[اس جملہ پر دونوں ہنستے ہیں]

مجیب:— وائرلیس نہیں بھائی لاسلکی یا بے تارکی تاربرقی کہو۔ معلوم ہے کہ آپ انگریزی بہت جانتے ہیں [اس جملے کی بے لطفی پر وہ خود مسکراتا ہے اور ظفر بھی تقریباً ہنستا ہے]

ظفر :— جناب کلاس تو آج کل گلزار ارم یا اندر کا اکھاڑا بنی ہوئی ہے۔ غالب نے اسی پر تو کہا ہے کہ یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے۔

مجیب :— واہ بھئی جنت نگاہ تو نظارہ ہے اور فردوس گوش کیا چیز ہے؟

ظفر :— خوب جناب خوب۔ آپ کی آواز میں اور [سامنے کی نشستوں کی طرف اشارہ کر کے] اورانکی آواز میں کوئی فرق ھے کہ نہیں ؟

حسن بے پروا خریدار متاع جلوہ ھے　　آئینہ زانوے فکر اختراع جلوہ ھے

مجیب :— (ھنستے ھوئے) واہ وا۔کیا کہنا۔کیا دلیل پیش کی ھے۔ غالب نے اسی موقع کے لئے تو یہ شعر لکھا تھا۔۔۔۔۔

[اتنے میں چار پانچ طالب علم داخل ھوتے ھیں علیك سلیك اور ھاتھ ملانیکے بعد آپس میں باتیں کرنے لگتے ھیں۔ اسکے بعد متواتر اور طالب علم داخل ھوتے جاتے ھیں اور گفتگو باھم ملی جلی ھوتی جاتی ھے۔ بیچ بیچ میں کچھ الفاظ صاف سنائی دیتے ھیں۔ نشستیں تقریبا بھر جاتی ھیں اسکے بعد گھنٹی کی آواز آتی ھے اور آواز کے ساتھ ھی پروفیسر صاحب داخل ھوتے ھیں۔ پروفیسر صاحب کے بعد ھی لڑکیاں داخل ھوکر سامنے کی نشستوں پر بیٹھ جاتی ھیں لڑکے پروفیسر کی آمد کے وقت اٹھ کھڑے ھوتے ھیں اور اسی اثناء میں ڈسکوں کی آوازوں کا ایك ملا جلا شور پیدا ھوکر غائب ھوجاتا ھے۔ فرض کرلیجئے کہ یہ پروفیسر صاحب ادریسی صاحب کے نام سے مشہور ھیں]۔

پروفیسر :— [ایك کتاب کھول کر ورق گردانی کرتے ھوئے اس اثناء میں سب لڑکے اور لڑکیاں اپنی کتابوں میں سے ایك کتاب نکالتے ھیں] ھاں صاحب شروع کیجئے۔ آج غالب ھے نا۔

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا　　تماشائے بیك کف بردن صد دل پسند آیا

آپ صاحبین میں سے کوئی اس شعر کا مطلب بتائیگا [شروع سے آخر تك ایك نظر ڈالکر] اچھا آپ بتائے حسام الدین صاحب۔

حسام :۔ [کچه سونچتے هوئے] شمار سبحه یعنی تسبیح پڑھناهما رے مشکل اور مرغوب به محبوب کو پسند آیا ۔۔۔۔اور۔۔۔۔جناب دوسرے مصرع کا مطلب سمجه میں نہیں آیا ۔

وسیم :۔ (بهت آهسته سے اٹهکر نهایت آهستگی سے رك رك کر کهتا هے) جی صاحب میں ۔۔۔۔میں ۔۔۔۔

پروفیسر۔ هاں هاں وسیم صاحب آپ هی بتائے ۔

وسیم ۔ جی صاحب ۔۔۔۔بهت بهتر ۔۔۔۔ جی میں عرض کرنےوالا تها ۔۔۔۔۔

پروفیسر هوں هوں ۔

وسیم :۔ جی ۔۔۔۔ جی۔۔۔۔جی۔۔۔۔جی۔۔۔۔ که یه شعر بهت ساده اور سلیس ۔۔۔۔اور عام فهم هے ۔۔۔۔

ظفر :۔ خوب ۔

وسیم :۔ جی صاحب غالب کا مطلب یه هے که اس کا محبوب اس درجه عیار هے که وه اپنے عاشقوں کو فریب دینے کے لئے همیشه تسبیح پڑھا کرتا هے ، اور اسطرح اس کی ایك هتیلی میں جو تسبیح هوتی هے ۔۔۔۔ وه گویا که سیکڑوں عاشقوں کو دهوکا دیتی هے ۔

[یه مطلب سنکر کچه لڑکے هنستے هیں مگر پروفیسر کی موجودگی کا لحاظ کرتے ه ، اور کچه لڑکے جهك کرغور سے کتابوں کی طرف دیکهنے لگتے هیں] ۔

پروفیسر کوئی اور صاحب اس شعر کا مطلب بتائینگے ؟

ظفر :۔ میرے خیال میں خود غالب بهی اس شعر کا مطلب نہیں سمجهے هونگے ۔

[اس پر کلاس کے کچه اور لڑکے هنستے هیں] ۔

پروفیسر:۔ [یہ دیکھکر کہ لڑکوں میں سے کوئی اس شعر کا مطلب بتانیکے لئے تیار نہیں] اچھا سنئے۔ یہ شعر یقینا بہت زیادہ مشکل ھے۔ یہ غالب کے ابتدائی اشعار میں سے ھے، جب غالب کا دیوان شایع ہونے لگا تو اس میں غالب نے اپنا ابتدائی سخت مشکل اور ادق کلام شامل نہیں کیا۔ لیکن یہ شعر چونکہ بہت محنت اور جانفشانی سے لکھا گیا تھا۔ اس لئے اسکو کاٹنے پر غالب کا قلم نہ اٹھسکا۔

حسام:۔ غالب کا پورا ابتدائی کلام نسخۂ حمیدیہ میں موجود ھے یا اس سے بھی زیادہ کلام دستیاب ہوسکا؟

پروفیسر:۔ ہاں نسخۂ حمیدیہ میں غالب کا جتنا کلام درج ھے اسکے علاوہ اور بھی غالب کا کچھ کلام ھے۔ اکثر بالکل غیر مطبوعہ غزلیں جو کسی نہ کسی طرح دستیاب ہوگئیں رسالوں میں آپ لوگوں کی نظروں سے گذری ہونگی ......

وسیم:۔ جی صاحب [اٹھکر] میں دریافت کرسکتا ہوں کہ غالب نے یہ غزلیں اپنے مطبوعہ دیوان میں کیوں شریک نہیں کیں؟

پروفیسر:۔ اس وجہ سے کہ غالب کے زمانے کے لوگ ان کی مشکل گوئی سے عاجز تھے، اور ان پر طرح طرح سے حملے کرتے تھے چنانچہ ایک شعر بھی لکھا گیا جس میں غالب پر چوٹ کی گئی۔

کلام میر سمجھے اور کلام میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب اپنے ھمعصروں کی تنگ نظری اور تنگ فہمی سے عاجز آگئے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنے اشعار میں جابجا اسکی طرف اشارہ کیا ھے مثلاً:۔

نہ ستایش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ھیں میرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اسکے علاوہ ایک قطعہ بھی تو ہے۔ آپ لوگوں میں سے کسی کو یاد ہے۔

حسام :۔۔ مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل     سن سن کے جسے سخنوران کامل

آسان کھنے کی کرتے ھیں فرمایش     گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

پروفیسر :۔۔ ھاں اب اس شعر کا مطلب سن لیجئے۔

شمار سجہ مرغوب بت مشکل پسند آیا     تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ تسبیح کا پڑھنا۔ سجہ کے معنی ھیں تسبیح فارسی لفظ ہے، جسکا مفہوم ہے وہ چیز جس پر سبحان اللہ پڑھا جائے۔ یعنی تسبیح ۰۰۰۰۰۰ھاں تو ھمارے بت مشکل پسند کو تسبیح خوانی مرغوب ہے۰۰۰۰۰۰۰۰۰آپ کو سمجھنے میں دقت ھورھی ہے۰۰۰۰۰۰ اچھا پھلے نثر کر لیجئے ۰۰۰۰۰۰بت مشکل پسند کو شمار سجہ مرغوب آیا۔ یعنی ھمارے محبوب کو جو بہت دقت پسند واقع ھوا ہے، تسبیح خوانی بہت مرغوب ہے ۰۰۰۰۰۰۰اسکی توجیہ شاعر دوسرے مصرع میں کرتا ہے۔ کہ اسکے محبوب کے ھاتہ میں جو تسبیح ہے وہ گویا اسکے عاشقوں کے دل کا مجموعہ ہے۰۰۰۰۰۰۰۰ دیکھئے تسبیح میں سو دانے ھوتے ھیں۔ اور اسی طرح۔محبوب جو ایک ھاتہ میں سو دانے لئے ھوئے ہے! وہ سو دانے تسبیح کے دانے نہیں ھیں۔ بلکہ اسکے سو عاشقوں کے دل ھیں۔ اور مشکل پسند محبوب اس خیال سے مسرور ہے کہ میری ایک ھتیلی میں سو دل ھیں۰۰۰ اب غالباً آپ لوگ سمجھ گئے۰۰۰۰۰۰ اچھا دیکھئے۔ بت مشکل پسند کی مناسبت سے شمار سجہ وھاں کسقدر لطف پیدا کر رھا ہے۰۰۰۰۰۰۰۰ اور اس شعر کی فارسی بندشوں پر نظر رکھئے۔ سوائے "آیا" کے کوئی لفظ اردو نہیں۔ اگر اسکو پورا کر دیا جائے۔

شمار سجہ مرغوب بت مشکل پسند آمد     تماشائے بیک کن بردن صد دل پسند آمد

تو شعر بالکل فارسی ھو جاتا ہے۔ آپ سب لوگ سمجھ گئے یا اور اچھی طرح سمجھاؤں۔

[آرورا دروازے پر ایک لمحے کے لئے ٹھہر کر داخل ہوتی ھے۔ سب طالب علموں کی نظریں اسکی طرف اٹھہ جاتی ھیں۔ پروفیسر صاحب پہلے لڑکی کی طرف پھر غور سے پوری کلاس کی طرف دیکھتے ھیں۔ لڑکی سامنے کی صف میں لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ جاتی ھے۔ مجیب بے چینی سے نشست پر پہلو بدلتا ھے اسکے چھرے کا رنگ متغیر ھو جاتا ھے۔ اسکے پاس کے چند طالبعلموں کی نظریں اسکی طرف اٹھ جاتی ھیں۔ بالآخر اس بے محل سکوت کو جو تقریباً بیس سکنڈ طاری رھتا ھے، پروفیسر کی آواز توڑتی ھے]

پروفیسر:— ھاں اسکے بعد کا شعر—

به فیض بیدلی نو میدی جاوید آساں ھے　　　کشایش کو ھمارا عقدہ مشکل پسند آیا

یه شعر باوجود مشکل ھونیکے کسیقدر پر اثر ھے۔ میرے خیال میں اسکا شمار غالب کے بہترین اشعار میں ھونا چاھئے۔ یه فوراً معلوم ھوجاتا ھے که کون سا شعر شاعر کے دل سے نکلا ھے اور کونسا شعر اسنے محض شعر کہنے کی خاطر کہا ھے اچھا مجیب صاحب آپ اسکا مطلب بتائیے—

[مجیب بے چینی سے حرکت کرتا ھے]

مجیب:—[رسمی اخلاق سے] جی نہیں کوئی خاص بات نہیں (کتاب کی طرف غور کرکے) انسان اگر بیدل ھو یعنی اسے کسی قسم کی آرزو نہو تو اسکے لئے نا امیدی کوئی اھمیت نہیں رکھتی۔ خداوند تعالی کی صفت عقدہ کشائی نے ھمارے عقدۂ مشکل کو اسی لئے پسند کیا—

پروفیسر:— ٹھیک ھے۔ لیکن آپ آدھے مطلب کو زیادہ واضح نه کرسکے۔ سنئے۔ مایوسی، اور نا امیدی اسقدر بھیانک چیز ھے که کسی معمولی سی چیز میں مایوسی ھمکو پریشان کردیتی ھے۔ لیکن جب انسان میں بیدلی پیدا ھوجاتی ھے۔ یعنی وہ اپنی قوت احساس کے اثر میں نہیں رھتا تو نا امیدی اس کو

پریشان نہیں کرسکتی۔ ذات کشایش نے میری نو آمیدی جاوید کے عقدۂ مشکل کا یہ حل تجویز کیا کہ مجھے بیدلی عطا کی۔ یوں تو ذات کشایش معمولی معمولی عقدے ساجھایا ھی کرتی ھے۔ لیکن اس عقدے کو اسکی دقت کی وجہ سے ذات کشایش نے خاص طور پر انتخاب کیا اور بیدلی کو اسکا علاج تجویز کیا.............شعر صاف ہوگیا؟

حسام :— جی ھاں سمجھ میں آگیا

( گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ھے۔ پروفیسر صاحب کتاب بند کرتےھیں۔ طلباء اٹھ کھڑے ھوتےھیں۔ ایک بار پھر ڈسکوں کا ملا جلا شور ھوتا ھے۔ پروفیسر صاحب اور انکے ساتھ ساتھ اکثر طلباء جاتے ھیں۔ لڑکیاں دوسرے دروازے سے جاتی ھیں۔ لیکن آرودا بے خیالی میں اپنی کتابیں بھول کر آنکے ساتھ چلی جاتی ھے۔ جاتے ھوئے لڑکوں کے درمیان مجیب اور وسیم اور ظفر باقی رہ جاتے ھیں مجیب ایک انگڑائی لیکر آٹھتا ھے )

ظفر :— (مجیب سے) کیا ھے دوست آج بہت خاموش ھو۔ معلوم ھوتا ھے ملاقات ھوئی..........

(اسی اثناء میں وسیم صاحب آستین چڑھا کر پہنچتےھیں اور ظفر کے شانے پر زور سے ھاتھ رکھکر انتہائی غصے کے لھجے میں کھتے ھیں )۔

وسیم :— یہ کیا حرکت تھی جناب آپ کی..

ظفر :— ارے ارے خیریت تو ھے۔

وسیم :— جی صاحب...... (اور زیادہ تیز لھجے میں) جی صاحب..... آپ نے پوری کلاس اور پروفیسر کے سامنے میری توھین کی ھے (وسیم غصہ سے دانت کٹکٹاتا ھے ظفر زور سے ھنستا ھے اور مجیب آھستہ سے اٹھکر دونوں کے بیچ میں آتا ھے۔

مجیب :۔ ارے ارے وسیم صاحب یہ کیا ہے آپ دونوں شریف آدمی ہیں۔

وسیم :۔ جی صاحب۔۔۔۔۔۔جی صاحب۔۔۔۔۔۔جی صاحب کیا شرافت اسی کا نام ہے ۔۔۔۔۔۔جی صاحب میں ہرگز ایسے پاجیوں کو شریف نہیں سمجھتا۔

ظفر :۔ واہ، وسیم صاحب۔ غالب نے یہ شعر آپ ہی کی تعریف میں لکھا ہے۔

نوچیدن و پھاڑیدن وبر آنگ پڑیدن          کتّا زتو بلّی زتو بندر زتو آموخت

وسیم :۔ شرم نہیں آتی بے حیا کو ھنستا ہے۔

ظفر :۔ بسم اللہ وسیم صاحب رونا شروع کر دیجئے۔

وسیم :۔ ذرا زبان سنبھال کر بات کیجئے۔

ظفر :۔ بہت بہتر صاحب آپ خفا کیوں ہوتے ہیں [وسیم ایک کرسی پر بیٹھنے کو جاتا ہے۔ ظفر کرسی کھینچ لیتا ہے اور وسیم زمین پر گر پڑتا ہے] خدا حافظ وسیم صاحب جب تک آپ اٹھنے کی زحمت گوارا فرمائیں بندہ اجازت چاہتا ہے، غالباً آپ کو زیادہ چوٹ نہ لگی ہو۔

[ظفر جاتا ہے۔ وسیم ابھی اٹھنے بھی نہیں پاتا کہ آرورا بھولی ہوی کتابیں لینے آتی ہے۔ کتابیں اٹھاتی ہے۔ لیکن وسیم کی قطع دیکھکر وہ پھر بے خیالی میں اسطرح جانے لگتی ہے کہ اسکا ھاتھ ایک کرسی کی پشت سے ٹکرا جاتا ہے اور کتابیں بکھر جاتی ہیں۔ مجیب آگے بڑھ کر کتابوں کو جمع کرنے میں مدد دیتا ہے۔ آرورا خشک آواز میں "شکریہ"، کہکر باھر نکل جاتی ہے۔ اور مجیب اسکے پیچھے دیکھتا رہ جاتا ہے اسی اثناء میں وسیم گرد جھاڑتا ہوا اٹھتا ہے۔ صالح اندر داخل ہوتا ہے اور کتابیں بائیں ھاتھ میں لیکر دائیں ھاتھ سے وسیم سے ھاتھ ملاتا ہے۔ جھینپ مٹانیکے لئے مذاق کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔]

وسیم :— اخاہ صالح صاحب کلاس ہو جانیکے بعد اب آپ مشتے بعد از جنگ کی طرح تشریف لائے۔

صالح :— اور آپ مشتے نمونہ از خروارے کی طرح باقی رہ گئے۔

[مجیب پیچھے مڑتا ھے اور صالح سے مصافحہ کرتا ھے اسکا چھرہ بالکل اترا ھوا ھے)۔

صالح :— خیر تو ھے مجیب آج تو تمھارا رنگ روپکھ اور ھے۔

مجیب :— نہیں کوئی خاص بات نہیں۔

صالح :— پکھ تو ھے جسکی پردہ داری ھے۔

مجیب :— نہیں بھئی (گفتگو کارخ بدلنے کے لئے) اچھا اب اسکے بعد کونسی کلاس ھے۔

وسیم :— یہ تو انٹرول ھے۔ اچھا مجیب صاحب میں آپ سے ایک بات دریافت کرنا چاھتا ھوں کہ Co-education. کے متعلق آپکا کیا خیال ھے

مجیب :— میں تو کوئی ھرج نہیں سمجھتا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ھیکہ ساتھ تعلیم پانیکی وجہ سے ایک دوسرے کا کیر یکٹر نظروں کے سامنے رھتا ھے۔ آئندہ شریک زندگی کا انتخاب بہت آسان ھو جاتا ھے۔ اور صنفی اجنبیت باقی نہیں رھتی۔

وسیم :— اور کلاس کی فضا انتہائی آرٹسٹك ھو جاتی ھے۔

مجیب :— بد قسمتی سے میں آپکی طرح آرٹسٹ تو ھوں نہیں۰۰۰۰۰۰ لیکن میرا نقطۂ نظر بہت زیادہ عملی ھے۔ یعنی میں عملی زندگی کے لئے اس طریق تعلیم کو پسند کرتا ھوں ھماری قومی ترقی کو پردے نے بہت سخت نقصان پہنچایا۔ کیا خیال ھے آپکا صالح صاحب؟

صالح :— جناب میرا تو خیال یہ ھے کہ دنیا کا کوئی خیال صحیح نہیں۔

وسیم :— جی صاحب ۰۰۰۰۰۰ یعنی ۰۰۰۰۰۰

صالح :— یعنی دنیا احساس بے خیالی کا دوسرا نام ہے۔

مجیب :— پھر آپ فلسفے میں غوطے لگانے لگے ۰۰۰۰۰ یہ بتائیے جناب کہ کوایجوکیشن کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

صالح :— اگر ہو تو کوئی نقصان نہیں اگر نہ ہو تو کوئی نقصان نہیں۔

مجیب :— معلوم ہے کہ آپ بہت بڑے فلسفی ہیں لیکن ذرا صاف صاف الفاظ میں تشریح کیجئے

صالح :— بھائی صاحب میں تشریح نہیں کر سکتا۔ کوئی شخص زندگی کی کسی چیز کی تشریح نہیں کر سکتا زندگی اپنی تشریح خود کرتی ہے یا زیادہ واضح الفاظ میں آپ کو برنرڈ شا کا وہ قول تو یاد ہوگا۔

The Golden rule is that there are no golden rules.

یب :— خوب لیکن اگر اس قول پر عمل کیا جائے تو دنیا کے تمام کام بند ہو جائیں۔

صالح :— اور اب کون سے چل رہے ہیں۔ کیا اب بھی دنیا کے ہر قانون میں خامی نہیں ؟

مجیب :— خامیوں سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن کم خامیاں زیادہ خامیوں سے بہتر ہیں۔

صالح :— یہی سوال تو دنیا آج تک حل نہ کر سکی کہ با اصول طریقہ زیادہ مفید ہے یا بے اصول طریقہ۔

مجیب :— تو پھر دنیا اصول کی پابندی کیوں کرتی ہے۔

صالح :— یہ آپ کا خیال ہے دنیا مطلق اصول کی پابندی نہیں کرتی۔ دنیا دوسروں کو اور اپنے آپ کو یہ دھوکا دینا چاہتی ہے کہ وہ اصول کی پابندی کرتی ہے۔

[ظفر آتا ہے]

ظفر :— اخاہ صالح صاحب آپ بھی آخر مغرب کی جانب سے طلوع ہو ہی گئے۔ اچھا وسیم صاحب اب آپ کو تخت سلیمان کی قسم میرا قصور معاف فرمائیے ورنہ میں پرنسپل صاحب سے آپکی شکایت کر دونگا۔

صالح :— کیا شکایت ہے؟

ظفر :— وہ یہ کہ جناب وسیم صاحب ہماری یونیورسٹی میں دار المجانین کی فضاء پیدا کر رہے ہیں۔

صالح :— کیا بات ہے بھئی وسیم آخر یہ قصہ کیا ہے۔

وسیم :— ارے کچھ بھی نہیں یار بیوقوف ہے وہ۔

مجیب :— اور انکا آپ کے متعلق بھی یہی خیال ہے۔

وسیم :— درست ہے آپ بھی او ہم سگ زرد برادر سفال نکلے ۰۰۰۰۰جی صاحب ۰۰۰۰۰
جی صاحب ۰۰۰۰۰(جاتا ہے)

صالح :— بیٹھئے بیٹھئے ظفر صاحب بیٹھئے۔

ظفر :— ابھی آتا ہوں ذرا جنرل کریک کو اور ستا لوں۔ جان بےری مور کا ڈرامہ جنرل کریک
آپ نے دیکھا ہوگا وسیم صاحب، پھر کیسا پھبتا ہوا خطاب ہے (جاتا ہے)

مجیب:— ان لوگوں کی زندگی کس قدر با مسرت، زندگی ہے۔ انکے نزدیک زندگی ہنسی کا
نام ہے اور ہمارے نزدیک بےلطفی کا۔

صالح:— کیا واقعی تمہارا یہی خیال ہے؟ صرف مسرت ہی تو وہ چیز ہے جو زندگی میں
حاصل نہیں ہوسکتی۔

مجیب:— اچھا صالح صاحب ایک نہایت ہی ضروری امر میں آپ سے مشورہ لینا ہے۔ میں
آپ کے یہاں آج ہی کسی وقت حاضر ہونگا۔

صالح :— بہت بہتر آج ہی۔

[جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے]

## دوسرا منظر

[صالح کا مکان ایک صاحب ہارمونیم پر گاتے نظر آتے ہیں۔ گانیکے بعد
وحید کہتا ہے]۔

وحید :— موسیقی تو غذائے روحانی ھے۔

صالح :— ھاں اسوجہ سے کہ موسیقی غذائے روحانی ھےاوراب دنیا کو اسکی پروانہیں رھی۔ آج کل لئے سے پڑھنے کارواج عام ھوتا جارھا ھے۔ اورھمارا قدیم علم موسیقی زوال پذیر ھورھا ھے۔ میں نےباضابطہ موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔

وحید :— خوب

صالح :— ھاں زمانہ ھوا۔ میں نے انتہائی شوق سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ایک قدیم استاد سے ...... لیکن اسکے بعد جھاں اور تمام باتیں چھوٹیں موسیقی بھی چھوٹی۔

وحید :— کیا پہلے آپ شاعر بھی تھے۔

صالح :— نہیں [اپنی نشست سے اٹھکر وحید کے پاس آکر کھڑا ھوتا ھے اور وحید کے شانے پر ھاتھ رکھکر کھتا ھے] کیونکہ موسیقی اور شاعری کبھی ایک شخص میں جمع نہیں ھوسکتیں باوجود ایک دوسرے سے قربت کے ان دونوفنون لطیفہ کا ایک ھی شخص میں یکجا ھونا ناممکن ھے۔

وحید :— تعجب ھے۔

[ایک صاحب شملہ باندھے ھوئے کوٹ پہنے ھوئے اندر داخل ھوتے ھیں صورت سے کسیقدر دھقانیت پائی جاتی ھے انکا نام ابراھیم ھے]۔

ابراھیم :— اجی السلام والیکم حضرت [صالح پیچھے پلٹ کر دیکھتا ھےاور پھر اخلاق سے ھاتھ ملاتا ھے۔

صالح :— وعلیکم السلام جناب آئیے بیٹھیے۔

ابراھیم :— اجی حضت، وہ کتاب آپ دیتاؤں بول کے بولے تھے نا؟ وہی کتاب لینے کو میں آیا ......

وحید :۔ آپ کا اسم شریف

صالح :۔ آپ ابراھیم صاحب ھیں لائور کے رھنے والے ھیں، اسی سال فرسٹ ایر میں
آکر شریک ھوئے ھیں۔

ابراھیم :۔ جی ھا وحضت میرا نام ابراھیم ھے۔

[وحید ھنستا ھے اور صالح نہایت سنجیدگی سے وحید کی طرف دیکھتا ھے]۔

صالح :۔ معاف کیجئے جناب اگر اس فضاء میں آپ پرورش پاتے تو آپ کا لھجہ اور
طرز گفتگو یہی ھوتا۔

ابراھیم :۔ بہوت بہوت شکریہ زناب آپ کاپن وکتاب ذرا زلدی دیدئے تو ٹہیك ھے۔
کیونکہ میرےکو اور ایك جائے جانا ھے۔

صالح :۔ بہت اچھا ابراھیم صاحب لیجئے وہ کتاب یہی ھے۔ اسکو ذرا غور سے پڑھئیگا
اور اسکی مدد سے اپنا تلفظ ٹہیك کیجئیگا۔

ابراھیم :۔ ضرور۔ ضرور۔ حضرت ضرور۔ اچھا اب خدا حافظ حضت۔ آپ کا
بہوت بہوت شکریہ۔ پہر ملاقات ھوئیگی۔

(صالح اور وحید دونوں سے ھاتہ ملاکر جاتا ھے۔ وحید ھنستا ھے صالح
کچہ دیر تك غور کرتا رھتا ھے اور اسکے بعد ایك کرسی پر بیٹہ جاتا ھے)

وحید :۔ آپ نے بہی عجیب دوست پائے ھیں۔

صالح :۔ زبان اور لہجہ بہی سوسائٹی کے تمامتر معیاروں کی طرح کتنا بے تکا
معیار ھے۔ ایك شخص اگر آپ کی زبان نہ جانتا ھو اور آپ سے اپنی مادری
زبان یعنی انگریزی۔ فرانسیسی یا فارسی میں گفتگو کرے تو آپ مرغوب
ھوجاتے ھیں۔ اور ایك دھقانی انتہائی سادگی سے اپنے اصلی لب
ولہجے میں بات کرے تو آپ ھنستے ھیں۔

وحید :— خوب لیکن جس زبان میں وہ بات کررھا تھا وہ غالباً آردو ھی تھی۔ فرانسیسی یا جرمن زبان نہ تھی۔ وہ اگر غلط آردو بولے اور اسکی غلط اردو کی ھنسی اڑائی جائے تو آپ سوسائٹی کی ذھنیت کا خواہ مخواہ ماتم کرتے ھیں۔

صالح :— درست۔ وہ اگر غلط آردو بولے تو آپ ھنستے ھیں اور کوئی انگریز غلط سے غلط اردو بولے اس پر آپ ذرا ھنس لیجئیے تو میں جانوں۔

وحید :— اچھا صاحب آپ خواہ مخواہ گرم ھوئے جارھے ھیں۔ میں معافی چاھتا ھوں کہ میں نے آپ کے مہمان کی توھین کی۔

صالح :— کیا خوب۔ جب خون کرچکے تو خونبہا ادا کردیا۔ جب ذلیل کرچکے تو معافی مانگ لی۔ پھر یہ کہ قتل ایک شخص کیا جاتا ھے۔ اور خونبہا دوسرے لوگ پاتے ھیں۔ اسی طرح ذلیل آپ نے ایک آدمی کو کیا اور معافی دوسرے سے چاہ رھے ھیں۔ یہ ھمارے انصاف کا معیار ھے۔

وحید :— اتنی معمولی معمولی باتوں سے اسقدر خوفناک نتائج نکالنا آپ ھی کا کام ھے۔

صالح :— معاف کیجئیگا جناب نہ دنیا کی کوئی بات معمولی ھے نہ کوئی نتیجہ خوفناک۔ جسکے معنی یہ ھیں کہ دنیا کی ھربات معمولی ھے اور ھر نتیجہ خوفناک۔

وحید :— یا تو میں ھی آپ کے اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکا یا آپ کے اس جملے کا کوئی مطلب ھی نہیں۔

صالح :— خیر میں آپ کو سمجھائے دیتا ھوں۔ فی الحقیقت دنیا کے کسی بڑے سے بڑے کام کو باعتبار اھمیت کسی چھوٹے سے چھوٹے کام پر کوئی فوقیت نہیں۔ صرف تخئیل کسی چیز کی اھمیت کو گھٹاتا یا بڑھاتا ھے۔ ایک درخواستگذار

کسی با اختیار حاکم کے پاس ایک درخواست لیکر جاتا ھے جسکی منظوری یا نا منظوری اسکی زندگی اور موت کا سوال ھے ۔ لیکن حاکم اسکی ضروریات کا خیال کئے بغیر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرتا ھے ۔ یہ کیا ھے دونوں کے تخئیل اور تخیل اھمیت کا فرق ....... اب تو غالباً سمجھگئے ھونگے آپ ۔

وحید :۔ جی ھاں سمجھ تو گیا ۔ مگر سر میں درد بھی ھونے لگا ۔ اگر کسی کو دردسر کی ضرورت ھو تو کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ جائے ........

[مجیب بہت آھستہ آھستہ آتا ھے گویا کسی خیال میں غرق ھے ۔ اور بغیر رسمی طور پر ھاتھ ملانے یا سلام تک کرنیکے ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ھے ]

صالح :۔ [وحید سے مخاطب ھوکر] وحید صاحب آپ جانتے ھیں کہ میں اخلاق کو بالکل جھوٹ اور ریاکاری کے برابر سمجھتا ھوں ۔ اسلئے میں انتہائی صاف گوئی سے آپ سے کہے دیتا ھوں کہ اسوقت مجھے مجیب صاحب سے ایک خاص معاملے میں گفتگو کرنا ھے ۔ باوجود مجیب صاحب سے آپکے اسقدر مراسم ھونیکے ، آپ کے سامنے وہ گفتگو نہیں کیجاسکتی ۔ اگر آپ اسوقت تشریف لیجائیں تو ھمارے لئے سھولت کا باعث ھوگا ۔

وحید :۔ آپ کی صاف گوئی کا شکریہ ۔ صالح صاحب آپ کی یہی بات تو مجھے سب سب سے زیادہ پسند ھے ۔

[صالح سے اور پھر مجیب سے ھاتھ ملاتا ھے ۔ مجیب اسطرح گویا اچانک نیند سے چونک پڑا ھو ۔ اٹھکر کھتا ھے ۔ ,, مزاج شریف ،، پھر اسی طرح بیٹھ جاتا ھے ۔ وحید چلا جاتا ھے ۔ صالح ، مجیب کی کرسی کے قریب ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ھے ]

صالح :۔ ھاں مجیب صاحب اب اپنی داستان عشق سنائیے ۔

مجیب :ـــ (چونک کر) عشق کی داستان ؟ تم کو غیب کی باتیں کیسے معلوم ہو جاتی ہیں؟

صالح :ـ آپکا چہرہ ، آپ کی آنکھیں یہانتک کہ آپ کی نقل وحرکت ظاہر کر رہی ہے کہ آپ جنون کی پہلی منزل میں ہیں جسکو عشق کہتے ہیں ـ

مجیب :ـــ (دلچسپی کے ساتھ دہرا کر) جنون کی پہلی منزل جسکو عشق کہتے ہیں ...... اسکے بعد جنون کی اور کتنی منزلیں ہیں ـ

صالح :ـــ صرف ایک منزل جسکو فلسفیت کہتے ہیں ـ یعنی وہ زمانہ جب ناکامیوں سے تنگ آکر یا کامیابیوں سے اکتا کر ساری دنیا کو ظالم اور اپنے آپ کو مظلوم تصور کرتا ہے ـ یہ جنون کی دوسری منزل ہے جس مین غالباً میں ہوں ـ

مجیب :ـــ (کسیقدر مذاق اور کسیقدر سنجیدگی لیکن دلچسپی سے) اچھا تو پھر کپڑے پھاڑنا پتھر مارنا اور دارالمجانین کو آباد کرنا جنون کی تیسری منزل ہے؟

صالح :ـــ نہیں وہ جنون نہیں بلکہ عین خردمندی ہے ـ آپ ان دیوانوں کو دیوانہ سمجھتے ہیں اور وہ آپکو دیوانہ سمجھتے ہیں ـ

مجیب :ـــ (ہنس کر) اچھا بھئی اب خدا کیلئے اپنی بکواس ختم کرو ـ جب میں یہاں آیا تو کسیقدر مغموم تھا ـ لیکن تمہاری باتوں میں خواہ مخواہ جی لگ جاتا ہے تمہاری باتوں میں حقیقت نام کو بھی نہیں ہوتی ـ

صالح :ـــ اچھا خیر اب اپنی داستان سناؤ ...... (انتہائی سنجیدگی سے اٹھکر چند سکنڈ تک ٹہلتا ہے ـ یہ مہلت وہ محض اسلئے دیتا ہے کہ گفتگو میں جو زندہ دلی پیدا ہو گئی تھی ـ اسکا اثر زائل ہو جائے ـ چنانچہ مجیب کا چہرہ اس اثنا میں پھر وہی غم کی کیفیت پیدا کرلیتا ہے ـ صالح پھر اسی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے اور آگے کی طرف اسطرح جھک جاتا ہے جیسے کوئی پیشہ ور وکیل اپنے موکل کی گفتگو سننے پر آمادہ ہو ـ اسکے بعد وہ آہستہ سے کہتا ہے ”ہاں“

مجیب :— قصه یه هے که جس زمانه مین کالج شروع هوا.....

صالح :— بس کافی هے پورا قصه میری سمجه میں آ گیا۔

مجیب:— (انتہائی تعجب اور بے یقینی سے) کیا؟

صالح :— ایك جملے سے پورا قصه میری سمجه میں آ گیا۔ اس جملے کا مطلب یه تہا که تم کو کوئی ایسی لڑکی سے محبت هے جو اسی کالج میں شریك هوئی هے۔ اچها اب یه بتاؤ که وه آرورا هی هے نا؟

مجیب :— (انتہائی تعجب سے) هاں۔ لیکن میں نے آج تك کسی سے ذکر نہیں کیا۔

صالح :— هاں لیکن تمهاری خوش مذاقی سے مجهے توقع تہی که تمهاری نگاه انتخاب آرورا هی پر پڑیگی۔ اچها اب ایك بات اور سنو۔ تمهاری محبت میں زیاده هیجان آج هی سے برپا هوا جسکے معنی یه هیں که آج کوئی نہایت هی معمولی واقعه پیش آیا هوگا۔

مجیب:—هاں بالکل یہی بات هے کلاس میں وه کتابیں بهول گئی تہی۔ کچه دیر کے بعد انکو واپس لینے آئی۔ لیکن کتابیں پهر اسکے هاته سے گر کر زمین پر بکهر گئیں میں نے انکو یکجا کرنے اور اٹهانے میں مدد دی۔ وه شکریه ادا کر کے چلی گئی۔ بات نہایت معمولی تہی۔ لیکن اسکا میرے قلب پر جو اثر هوا وه بیان نہیں کیا جا سکتا۔

صالح :— تو اب کیوپڈ نے تیراندازی کے لئے کو ایجوکیشن کو ایجاد فرمایا هے۔ اچها هے تعلیم کے ساته درس عشق بہی سہی۔ تعلیم هی کیا کم تباه کن تہی۔ اب عشق اور بہی مٹی پلید کر دیگا۔ (انداز گفتگو بدلکر سنجیدگی سے) آپ مرض کے دوسرے درجے مین هیں۔

مجیب :— دوسرا درجه کیا؟

صالح :۔ یعنی جب عاشق محض تفریحاً عشق کرنیکی کوشش سے گذر کر اس خام خیالی میں مبتلا ہو جاتا ھے کہ اسے فی الحقیقت عشق ھے ۔

مجیب :۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں صالح ، میں ایک مدت سے اس آگ کو دل میں چھپائے ہوئے ہوں اور میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دل ، میرا دماغ ، یہاں تک کہ میری روح ، محبت کے گداز سے پھنک رہی ھے ۔ مجھے دنیا کے کسی کام میں لطف نہیں آتا ۔ اب مجھکو اس کا احساس ہو رہا ھے کہ میری ھستی کی خلقت کا مدعا کیا ھے ۔ دنیا کی نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت محبت ھے ۔ خصوصاً جب کہ پاک اور شریفانہ محبت ہو ۔

صالح :۔ تو آپ افلاطون کے فلسفۂ محبت کی پیروی کر رہے ہیں ....مگر خیر... جو خیالات اس روانی اور اس خوش الحانی کے ساتھ تم نے میرے سامنے ظاہر کئے، انکو کسی نظم میں ظاہر کرتے تو لطف بھی آتا ۔

مجیب :۔ دیکھو صالح یہ موقعہ مذاق کا نہیں ۔؟؟ میرے بولنے کا مقصد یہ تھا کہ میرے ارادے ہر طرح شریفانہ ہیں ، میں شادی کی درخواست کرنا چاھتا ہوں اور اس معاملے میں میں تم سے مشورہ لینے آیا ہوں ۔

صالح :۔ قبل اسکے کہ میں آپ کو مشورہ دوں میں دریافت کرنا چاھتا ہوں کہ رازداری کے لئے آپ نے مجھے کیوں انتخاب کیا ؟

مجیب :۔ کیونکہ دوسروں کی زبانیں بہت شیریں ہیں مگر دلوں میں زھر بھرا ہوا ھے ۔ تم ظاھرا مذاق اڑانیکی کوشش کرتے ہو مگر تمھارا خلوص تمھاری سچی انسانی ھمدردی چھپی نہیں رہ سکتی ۔ تم اسکی کوشش کرتے ہو کہ لوگوں کو تمھارے متعلق غلط فھمی ہو اور اس کوشش میں تم انکو

برا بھلا کہتے ھو - تمہارے پہلو مین ایك دل ھے، جو ماضی کی ایك داستان دکھتا ھے - تمہاری باتیں بعض اوقات حقیقی معنوں مین زندگی کا عکس ھوتی ھیں - گو کہ کبھی کبھی تم بھٹك بھی جاتے ھو ........ اب مجھے زیادہ پریشان نہ کرو - تمہارے سوا کوئی اور شخص مجھے صحیح رائے نہیں دے سکتا -

صالح :- معاف کرنا بھئی مجیب - ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ کر تمہاری ذھنی کفیت اور تمہاری محبت کی حالت کااندازہ لگا رھا تھا - اس موقع پر میری ٹیڑھی ترچھی باتوں سے تمکو تکلیف تو ھوئی ھوگی ...... اچھا اب غور سے سنو - صرف خیالی عمارتیں تعمیر کرنے سے حاصل نہیں، امکانات اور واقعات کا خیال ضروری ھے ..... پہلی بات یہ ھے کہ اس لڑکی کی نسبت سیموئیل جیوفرے کے ساتہ ھوچکی ھے - تمکو معلوم ھے -

مجیب :- ھاں -

صالح :- اب اسکے بعد اپنی کامیابی کے امکانات پر غور کرو - دوسری بات جو مین تم سے کہنا چاھتا ھوں وہ یہ ھے کہ ابھی تو جذبات کے زور سے مغلوب ھوکر ایك رو مین تم بہے چلے جا رھے ھو - مگر جب شادی کے بعد عملی زندگی کا سوال آئیگا تو کس حد تك تمہاری زندگی مسرت بھری زندگی ھوگی - مثلاً یہی ایك بات کہ تم کیونکر کہہ سکتے ھو کہ اس کا چال چلن قابل اطمینان ھے -

مجیب :- (ترشروئی سے) صالح تمکو کسی شریف لڑکی کے چال چلن پر حملہ کرنیکا کوئی حق نہیں -

صالح :- مین نے چال چلن پر کسی قسم کا حملہ نہیں کیا - مگر شاید تم شکسپیر کا وہ قول بھول گئے جسکی صداقت کے تم خود بہت معترف تھے -

**Frailty thy name is Woman.**

مجیب :۔ (ناخوشگوار لہجے میں) میں آپ سے نصیحتیں سننے نہیں آیا ہوں ۔ اگر مجھے صرف نصیحتیں ھی سننے کا شوق ھوتا تو میں والد صاحب سے سن سکتا تھا۔

صالح :۔ معاف کرنا بھئی۔ مگر تمھارے والد کی نصیحتوں اور میری نصیحتوں میں بڑا فرق ھوگا۔ انکو تمھارے جذبات کا زیادہ خیال نہوگا اور مجھے تمھارے جذبات ھی کا خیال ھے۔

مجیب :۔ بس میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا (اٹھکر جانیکی کوشش کرتا ھے۔ صالح تیزی سے راستہ روك کر کھڑا ھوجاتا ھے۔ صالح ایك لمحے تك غضبناك نظروں سے اسکو دیکھتا ھے، پھر کچھ ٹھنڈا پڑ جاتا ھے)

صالح :۔ میاں تم ابھی بچے ھو۔ جذبات پر اتنا قابو نہیں تو آگے بڑھ کر کیا کرسکوگے۔ آؤ بیٹھو (مجیب کا ھاتھ پکڑکر ایك آرام کرسی پر بیٹھا دیتا ھے۔ اور پھر خود قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتا ھے) اچھا اب اپنا غصہ تھوکدو اور غور سے سنو۔ محبت دو طرح سے کی جاتی ھے۔ ایك دل سے محبت کرنیکا طریقہ ھے اور ایك دماغ سے محبت کرنیکا طریقہ (مجیب کی استھفامی نظروں کا مطلب سمجھ کر) غالباً دل سے محبت کرنا اور دماغ سے محبت کرنا تمھاری سمجھ میں نہیں آیا؟ اچھا سنو۔ دل سے محبت کرنا یہ کہ اپنے کو محبت کے حوالے کردینا محبت جسطرح رھنمائی کرے اسیطرح چلنا اور محبت جس رخ بہائے اسی رخ بہنا۔ اسکا نتیجہ زیادہ تر ناکامی ھوتا ھے۔ اپنے آپ کو محبت کے حوالے کردینا ایسا ھی ھے جیسے اپنی کشتی کو طوفان کے حوالے کردینا۔ محبت کرنیکا دوسرا طریقہ یہ ھے کہ عقل و شعور کے ساتھ محبت کرو۔ اپنی محبوبہ کی نفسی کیفیت کا اندازہ کرو اور اسکے بعد پھونك پھونك کر قدم رکھو۔ یہ سمجھ کر محبت کروکہ تم کسی ڈرامے میں عاشق کا پارٹ کررھے ھو۔ دفعتاً اظہار محبت مت کرو آھستہ آھستہ جال پھیلاؤ۔ اسکے منگیتر کو

مذاق مذاق میں سب کے سامنے یہانتک کہ اسکے سامنے ذلیل کرو۔ پوری طرح رومیو بننے کی کوشش کرو - تب کہیں کامیابی کی کچھ امید ہو سکتی ہے۔ اور ان کوششوں کے بعد اگر ناکام بھی رھوگے تو کم از کم جگ ھنسائی تو نہوگی۔ دنیا مکر و فریب کا گھر ھے۔ اس کی امید مت رکھو کہ تم اس سے کچھ فائدہ حاصل کرسکوگے۔ دنیا اسوقت تک تمکو کچھ ندیگی جب تک تم اس سے زبردستی کچھ چھین کر نہ لوگے۔ تنازع البقاء کی صحیح تعریف یہی ھے۔

مجیب :- اس تمام بحث سے آپکا مدعا کیا تھا؟

صالح :- یہی کہ ھر جائز و نا جائز طریقے سے اپنے مقصد براری کی کوشش کرو۔ دنیا میں انصاف کا وجود نہیں۔ میں نے تمھاری محبوبہ کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس سے میرا مقصد محض یہی تھا کہ تم ابتک اسکو فرشتہ سمجھتے رہے ہو اب اسکو انسان سمجھو۔ محبت کی سب سے خطرناک قسم افلاطونی محبت ھے۔ بد قسمتی سے تم پر اسکا اثر زیادہ ھے۔ لیکن اگر تم کامیابی چاھتے ھو تو ھر قسم کی چالاکی مکاری عیاری اختیار کرو۔

مجیب:- کیا خوب نصیحت ہو رہی ھے۔ سنو میں آرورا کو پہلے بھی فرشتہ سمجھتا تھا اور اب بھی سمجھتا ہوں اور ھمیشہ سمجھتا رھوں گا (طنزیہ بتسم کے ساتھ) اب مجھکو آپ کے مشورے کی مطلق ضرورت نہیں رھی۔ میں آپ سے مکاری کا سبق لینے نہیں آیا تھا۔ میں آرورا سے اظہار محبت کروں گا (جوش میں آکر) اور ضرور کرونگا۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے اس جاودانی محبت سے روک نہیں سکتی۔۔۔۔ (غصے سے) مگر اب میں محسوس کرتا ھوں کہ اپنی محبت کا راز آپ سے کہنے میں میں نے کتنی بڑی حماقت کی۔

بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

صالح :۔ سبحان اللہ بریں عقل و دانش بباید گریست۔ آپ ناحق مجھے اپنی رقابت کا مرتبہ دیتے ہیں۔ سموئیل ہی آپ کی رقابت کے لئے بہت کافی ہے۔ ہمارے شعرا نے جہاں اور بہت سی خرافات کو نظم کیا ہے، وہاں ایک حقیقت کو بھی بیان کیا ہے کہ واقعی محبت میں انسان اندھا بھی ہو جاتا ہے۔

مجیب:۔ شکریہ آپ کے الفاظ کا۔ (اُٹھکر صالح پر ایک حقارت کی نظر ڈالتا ہے اور پھر حقارت کے لہجے میں کہتا ہے) اب میں اجازت چاہتا ہوں لیکن جانیسے پہلے آپ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کئے دیتا ہوں۔ ابتک میں آپ کو خدا جانے کسقدر عزت کی نظروں سے دیکھتا تھا اور اب مجھے محسوس ہوا کہ

One may Smile and Smile and be a villain.

(مجیب جاتا ہے۔ صالح ہنستا ہے پھر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے۔

پردہ آہستہ آہستہ اس منظر کو نظر سے چھپا دیتا ہے)۔

# دوسرا ایکٹ

## پہلا منظر

[آرورا کا نہایت آراستہ ڈرائنگ روم۔ دیواروں پر تصویریں۔ زمین پر نہایت عمدہ فرش اور فرش پر صوفے۔ جس وقت پردہ اٹھتا ہے آرورا اپنی ہم کلاس سہلی لارا کے ساتھ بیٹھی ہوی نظر آتی ہے۔ سامنے میز پر ہارمونیم رکھا ہوا ہے]۔

آرورا:— لارا کچھ بھی سہی لیکن انگریزی موسیقی میں وہ نغمہ نہیں ہوتا جو ہندوستانی موسیقی میں پایا جاتا ہے۔ یہاں فن موسیقی بہت پرانا فن ہے۔

لارا:— ہاں مگر وہاں آواز کے اتار چڑھاؤ سے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

آرورا:— یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مغربی موسیقی میں اب بھی کسیقدر وحشیانہ پن ہے۔ موسیقی سلاد ینے والی چیز ہے، جگانے والی نہیں۔

لارا:— اچھا خیر آرورا تم اسوقت کچھ سناؤ گی بھی یا باتیں ہی کرتی رہو گی۔

آرورا:— اچھا۔ اچھا (اپنی جگہ سے اٹھتی ہے۔ اور میز کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہارمونیم کھولتی ہے اور تھوڑی دیر تک کمال فن سے محض ہارمونیم ہی بجاتی رہتی ہے۔ پھر غزل گانا شروع کرتی ہے)۔

[آرورا گانا ختم کرتی ہے۔ اسکے بعد دفعتاً سیموئیل داخل ہوتا ہے۔ سیموئیل سوٹ پہنے ہوئے ہے۔ داخل ہوکر وہ پرجوش اسپنیش (ہسپانوی) طریقہ پر ہیٹ اتار کر جھکتا ہے اور اپنے ہاتھ کو گھماتا ہے۔۔ آرورا مسکرا کر سر کے خم سے جواب دیتی ہے۔ سیموئیل ایک کرسی گھسیٹ کر دونوں سے بہت کافی فاصلے پر بیٹھ جاتا ہے]۔

سیموئیل :— یہاں آتے ہوئے میں نے میوزک کی پلیزنٹ، آواز سنی تہی۔ یا تو میں لیٹ پہنچا یا میرے آتے ہی آپ نے گانا فنش کر دیا۔

آرورا:— دونو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ تم دیر سے آئے۔ دوسرے یہ کہ تمکو گانے کی تمیز نہیں اسلئے گانا ختم کر دیا۔ [یہ کہکر آرورا ہنستی ہے۔ لارا مسکراتی ہے اور سیموئیل بہی چہرے سے خوشی کا اظہار کرتا ہے]۔

سیموئیل :— میوزک بہی کیا Marvellous چیز ہے جسکے Effect سے Soul بہی Fresh ہوجاتی ہے............ لیکن میں آرورا مجہے اسوقت آپ سے ایک Unpleasant topic پر گفتگو کرنا ہے۔

لارا:— کیا میں مخل ہوں۔

آرورا:— نہیں۔ مطلق نہیں۔ تم سے میری کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ ہاں سیموئیل۔ اب کہنا شروع کرو۔

سیموئیل :— (بہت زیادہ تکلف سے) ہاں۔ ہاں ..... میرا مطلب ہے I mean no offence

آرورا:— بات کرنے سے پہلے آپ نے معافی مانگنا شروع کر دی۔

سیموئیل Well, you see we are betrothed and we shell bave to pass the rest of cur lives together;......So you see.,....I mean...... I mean......we should make the matters clear......

آرورا:— اچھا اس لمبی چوڑی تمہید کے بعد کچہ کہنا بہی ہے۔

سیموئیل :— ہاں ..... I mean ....... I mean آپ مجیب نامی کسی اسٹوڈنٹ سے واقف ہیں۔

آرورا:۔ [جسکے چہرے کا رنگ یہ جملہ سنکر متغیر ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر وہ فوراً اطمینان قلب سے جواب دیتی ہے] نہیں۔

سیموئیل :—نہیں ‘‘No’’ ‥ You say ‘‘…But your face was telling a diffrent tale’

آرورا:— کیا؟.......تم ان الفاظ سے میری توہین کر رہے ہو۔

سیموئیل:—[دفعتاً بہت انکساری سے معافی چاہتے ہوئے]

By your pardon Aurora...I'msorry......I'm sorry

کیا واقعی آپ اس سے......but, but......I did'nt mean to offend......

واقف نہیں ؟۔

آرورا:— اگر واقف ہوں بھی تو کیا؟

سیموئیل:—تو کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ.........کہ.........کہ........

آرورا:—[بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے].........کیا؟........

سیموئیل:—یہ.......یہ کہ......[ہمت کر کے] اس نے آپ کو خط لکھا یا آج آپ سے

اس سے ملاقات ہوئی۔

آرورا:—[بے چینی اور بےصبری سے] میں تمھاری آلٹی سیدھی باتوں کا مطلب نہیں سمجھی۔

سیموئیل:—اسکے معنی یہ ھیں کہ —

Your'e going to abnadon me for him...That...means...That means...

[آرورا کا چھرہ غصے اور شرم سے سرخ ہو جاتا ہے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ لارا دلچسپی کی نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگتی ہے، آرورا رنجیدہ اور تکلیف رسیدہ آواز میں کہتی ہے]

آرورا:—میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کی شرافت صرف کپڑوں تک محدود ہے تو میں نے آپ کو پہچاننے میں سخت غلطی کی۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ........(کچھ کہنا چاھتی ہے۔ لیکن غصے کی وجہ سے کچھ کہ نہیں سکتی پھر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

سموئیل:—[تکلّف سے معذرت خواهی کے لہجے میں] How difficult it is to pleaseyou

اچها۔۔۔۔اچها۔۔۔۔۔۔۔۔

لیکن میں آپ کی گفتگو سے کیا Conclusion نکال سکتا هوں۔

ارورا:— [کسیقدر آهستگی کے ساته نرم اور آهسته لہجے میں سموئیل کو بهلانیکی کوشش کرتے هوئے]۔ اچها بس یه سمجه لوکه کوئی بات پیش نہیں آئی۔

سموئیل:—[بر افروخته هوکر] Well ۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے doubts کو Clear کردینا آپ کا فرض هے۔

ارورا:— Nonsense Samel تم ناحق اسقدر بر افروخته هو میں تم سے پورا واقعه بیان کئے دیتی هوں۔

سموئیل :— On your wood of honour Aurora?

ارورا:— On my word of honour ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سنو واقعه صرف اتنا هے که اسنے ایك خط میں اظہار محبت کیا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سموئیل:— And where the dickens that letter is?

ارورا:— In my waste-paper basket.

سموئیل:—مگر ارورا تمکو اسکے خلاف Steps لینا چاهئے تهے۔

ارورا:—یعنی؟

سموئیل:— Thet young deril requires sound punishment

ارورا:— س سے تمهارا مدعا کیا هے۔

سموئیل:— To see the scourdral rusticated

ارورا :— Behave Yourself آپ دیکهتے هیں

His intentions were honourable. He offered to marry me.

سموئیل :— Good! And you are going to marry him?

آرورا :— Always jumping at wild conclusions. ۰۰۰۰۰۰ تمہارے رشک و حسد کی کوئی انتہا نہیں —

سموئیل :— Feminine Frailty is capable of anything

آرورا :— Thank you - اور کوئی ذلت کی بات - سوائے ذلت کے آپ سے کیا توقع کی جاسکتی ھے —

سموئیل :— [پھر جھك کر اسیقدر تکلف سے] I'm Sory میں نے آپ پر personal attack نہیں کیا - آپ کی Sex ھی بہت زیادہ Inconstant واقع ھوی ھے ۰۰۰۰۰۰۰

آرورا :— آپ میری صنف کی توھین کر رھے ھیں جو میں ھرگز برداشت نہیں کر سکتی ۰۰۰۰ آخر آپ کا مقصد کیا ھے ۰۰۰۰۰۰۰

سموئیل :— کچھ بھی نہیں ۰۰۰۰۰۰۰ Of course ۰۰۰۰۰۰۰ کچھ بھی نہیں ۰۰۰۰۰۰۰

آرورا :— (عاجز آکر) اچھا خیر ۰۰۰۰۰۰۰ [دفعتاً مڑ کر] ۰۰۰۰۰۰۰ لارا اگر میری جگہ تم سے اظہار محبت کیا جاتا تو تم کیا کرتیں ؟

لارا :— [اس اچانك سوال پر کسیقدر چونك کر ، کسیقدر ھچکچا کر] میں ۰۰۰ میں ۰۰۰۰۰ (کچھ سونچکر) یا تو میں اس سے شادی کر لیتی یا اسے محض رسمی دوست بنا لیتی. کیونکہ خط سے معلوم ھوتا ھے کہ Sensible آدمی ھے —

آرورا :— ان میں سے پہلا طریقہ میرے لئے نا قابل عمل ھے —

سموئیل :— Why?

آرورا :— For you are a better fool

سموئیل :— خیر آپ کو اختیار ھے جو چاھیں کہیں - لیکن مجھے Satisfy کر دیجئے کہ آپ کا Finel decision کیا ھے —

آرورا:—[اسکی باتوں کی طرف توجه کئے بغیر لارا سے] شادی کیلئے تو مین نے Samel کو انتخاب کر لیا ھے کیونکه اس سے زیادہ خر دماغ شریف آدمی مشکل سے ملتا، میرا عقیده ھے۔

Choose the greatest idiot for your husband.

اسکے معنی یه ھیں که میری زندگی آرام سے گذرے گی، باقی رھا دوسرا طریقه میں اس شخص کو اپنا دوست نہیں بنا سکتی۔۔۔۔۔۔

There is something about him Idon't like.

سیموئیل:—[خوش ھوکر] Then

آرورا:— میں نے ایك بہت اچھی تجویز سوچی ھے۔

سیموئیل:—To marry him and me at the same time.

[اس پر آرورا اور لارا دونوں ھنستی ھیں]

آرورا:— میں پرنسپل سے جاکر شکایت کروں گی که اس شخص نے میری توھین کی ھے اسکا سدّباب کیا جائے۔

لارا:—اس سے فائده؟

آرورا:—لڑکوں کے attitude میں تبدیلی ھوجائے گی۔ ان کے سلوك میں شرافت پیدا ھوجائے گی جوکو ایجوکیشن کے لئے بہت ضروری ھے——ٹھیك ھے نا؟

سیموئیل:—بالکل ٹھیك۔

[پہلے آرورا اور اسکے پیچھے سیموئیل اور لارا باھر جانے لگتے ھیں مگر پرده پہلے ھی گر کر ان کو نظروں سے پوشیده کر دیتا ھے]۔

# دوسرا منظر

[ پرنسپل کا آفس۔ درمیان میں ایک بہت اچھی میز اس پر کتابیں اور کاغذات۔ آفس چیرا ور آس پاس کچھ اور کرسیاں۔ پردہ اٹھتا ہے اور پرنسپل کام کرتا ہوا نظر اتا ہے۔ آرورا اندر داخل ہوتی ہے اور پرنسپل اسکی طرف دیکھنے لگتا ہے ]۔

ارورا۔میں ۔۔۔۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔۔ [ کچھ اور کہنا چاہتی ہے مگر ادا نہیں کرسکتی

پرنسپل:۔۔ اسکی طرف مہربانی کی نظروں سے دیکھکر همت افزائی کرتے ہوئے کہتا ہے ]۔

پرنسپل:۔۔ ہاں کہو کہو ۔۔۔۔۔ تم کو کیا کہنا ہے۔

اورا:۔۔ اج ایک طالبعلم نے میری توھین کی ہے۔

پرنسپل :۔۔ توھین

ارورا:۔۔ جی ہاں توھین ۔۔۔۔۔ میرے نام ایک اہانت امیز خط آیا ہے۔

[ پرنسپل دلچسپی اور غور سے اسکی گفتگو سنتا ہے اور اطمینان کے لئے تیز لہجے میں پوچھتا ہے ]

پرنسپل:۔۔ تمہارا نام کیا ہے؟

ارورا:۔۔ ارورا سمائلیز

پرنسپل:۔۔ کس جماعت میں تعلیم پا رہی ہو۔

ارورا:۔۔ بی۔ اے۔ سینیر۔

پرنسپل:۔۔ اسی سال یہاں آکر شریک ہوئیں؟

ارورا:۔۔ جی اسی سال۔

پرنسپل:۔۔ اس سے قبل؟

ارورا:۔۔ کینگ کالج لکھنو۔

پرنسپل:۔۔مضامین کیا کیا ہیں ؟

ارورا:۔۔اردو۔فارسی ۔

پرنسپل:۔۔تعجب ہے۔تم نے یہ مضامین کیوں انتخاب کئے۔

ارورا:۔۔انہی مضامین کے لئیے میں یہاں اکر شریك ہوئی۔مجھے مشرقی ادب سے بہت دلچسپی ہے۔

نسپل:۔۔[مطمئن ہو کر] اچھا اب تم ایك کرسی پر بیٹھ سکتی ہو [ آرورا بیٹھ جاتی ہے ] اچھ اب کہو تم کو کیا کہنا ہے ۔

ارورا:۔۔ایك خط کے ذریعہ میری اھانت کی گئی ۔۔۔۔۔یہاں میں نے محسوس کیا کہ طالب علموں کا طرز عمل بہت زیادہ اچھا نہیں ۔

پرنسپل:۔۔ابھی تو ہمارے یہاں کو ایجوکیشن کی ابتدا ھے۔۔۔۔۔[بالکل کاروباری لھجے میں ] ھاں تم کو کیا شکایت ھے ۔

رورا:۔۔یہی له بعض ایسے جملوں سے میری اھانت کی گئی ھے جنکو عام حالات میں کوئی لڑکی برداشت نہیں کر سکتی۔

پرنسپل:۔۔کیا اس کے ثبوت میں وہ خط مجھکو دیا جا سکیگا ۔

ارورا:۔۔جی ھاں [خط دیتی ہے پرنسپل دل ھی دل میں خط پڑھتا ھے اس کے بعد اسکو اسیطرح بند کر دیتا ھے ] ۔

پرنسپل:۔۔اچھا مس اسمائلیز میں اس پر غور کرونگا اور پروفیسروں کی ایك میٹنگ میں اس پر غور کیا جائیگا ، اچھا اب تم جا سکتی ہو۔

[ آرورا جاتی ھے، پرنسپل گھنٹی بجاتا ھے چپراسی اندر داخل ہوتا ھے ]۔

پرنسپل:۔۔ادریسی صاحب ھیں یا جا چکے ۔

چپراسی:۔۔جی ھاوھیں صاحب ۔

پرنسبل:۔۔ انکو ذرا یہاں بلاؤ [ چپراسی جاتا ھے، اور چالیس سکنڈ تك خاموشی طاری رھتی ھے ۔

اس اثناء میں پرنسپل ادھر ادھر کا غذات دیکھتا رہتا ہے پروفیسر صاحب داخل ہوتے ہیں۔ پرنسپل صاحب ان سے ہاتھ ملا کر ایک کرسی کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں]۔

پرنسپل :— آپ مس اسمائاز کو جانتے ہیں؟

پروفیسر :— جی ہاں ہمارے یہاں فورتھ ایر میں ہیں ........ کیوں کیا کوئی خاص بات۔؟

پرنسپل :— جی ہاں ادریسی صاحب آج ایک اہم واقعہ پیش آیا ہے، جسکا آپ سے ذکر ضرروی ہے۔

پروفیسر :— [دلچسپی اور فکر کا اظہار کرتے ہوئے] جی۔

پرنسپل :— آج اسی لڑکی سے ایک طالبعلم نے اظہار محبت کیا ہے، خط کے ذریعے۔ طالب علم کا نام مجیب ہے۔ آپ جانتے ہیں؟

پروفیسر :— اچھی طرح سے ...... بہت ذہین اوسمجھدار طالب علم ہے۔

پرنسپل :— اب اس واقعہ کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔ اسنے صرف شادی کی درخواست کی ہے۔

پروفیسر :— بالکل درست۔ لیکن ابھی ھندوستان اس قسم کے واقعات کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

پرنسپل :— امیں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

پروفیسر :— اس قسم کے واقعات کالج کی بدنامی کا باعث ہوتے ہیں۔

پرنسپل :— لیکن اس نے صرف شادی کی درخواست کی ہے۔

پروفیسر :— معاف کیجئے گا صاحب آپ ابھی ابھی یورپ سے واپس آرہے ہیں۔ وہی فضا آپ کے دماغ میں بسی ہوی ہے یہ ھندوستان ہے۔

پرنسپل :— کیا آپ کا خیال ہے کہ اس طالب علم کا مدعا غیر شریفانہ تھا؟

پروفیسر:— ممکن ہے کہ اسکا مدعا شریفانہ ہو۔سوال اسکے مدعا کا نہیں ہے، اسکے مدعا کے اثرات کا ہے۔

پرنسپل:— اسکی وجہ غالباً یہ ہے کہ ملک میں ابھی تعلیم کی کمی ہے۔ ادریسی صاحب خیال توکیجئے کہ کوایجوکیشن سے ہمارا ایک مدعا یہ بھی تو ہے کہ لڑکے اورلڑکیاں باہم میل جول اور رسا بقے کے بعد اپنے شریک زندگی کو انتخاب کرسکیں۔ پھر اس حد تک توھمکو تیار رھنا چاھیئے۔

پروفیسر:— میں پھر یہی عرض کرونگا کہ یہ ھندوستان ہے۔

پرنسپل:— اچھا تو اسکا تصفیہ ھم پروفیسروں کی ایک میٹنگ میں کرین گے۔ مگر اس سے قبل اس لڑکے سے چند سوالات کرلینا چاھیئے۔

پروفیسر:— بہت بہتر۔ [پرنسپل گھنٹی بجاتا ہے۔ چپراسی آتا ہے]

پرنسپل:— [ایک کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھکر چپراسی کو دیتا ہے]۔یہ پرچہ مجیب احمد طالب علم سال چہارم کو لیجا کردو[چپراسی جاتا ہے] اس وقت چھہ بج رہے ھیں آج میں بہت دیر تک ٹھہرا رھا۔ میرے خیال میں اس وقت توکوئی پیریڈ نہ ھوگا۔ ممکن ہے کہ سب لڑکے گھروں کو جاچکے ھوں۔

پروفیسر:— جی نہیں۔ چھ سے سات تک میں فورتھ ایر کی اکسٹرا کلاس لیتا ھوں۔غالباً لڑکے موجود ھونگے اور وہ بھی ھوگا [چپراسی، مجیب کے ساتھ داخل ھوتا ہے۔ مجیب پرنسپل کو سلام کرتا ہے۔ چپراسی چلاجاتا ہے]۔

پرنسپل:— تمھارا نام مجیب ہے؟

مجیب:— جی ھاں۔

پرنسپل:— تمھارے خلاف چند شکایات کی گئی ھیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ تمھارا چال چلن قابل اطمینان نہیں —

یب:— [تعجب کا اظھار کرتے ھوئے] میرا چال چلن؟

پرنسپل :۔ تمہاری کلاس کی ایک لڑکی مس اسما ئلز نے شکایت کی ھے کہ تمنے اسکی اھانت کی ھے ۔

مجیب :۔ اھانت !

پرنسپل :۔ ھاں اھانت اس طرح کہ تمنے اس سے محبت کا اظہار کیا ........ میری ذاتی رائے یہ ھے کہ تمہاری شادی کی درخواست بالکل شریفانہ تہی ....

پروفیسر :۔ اھم ۔

پرنسپل :۔ لیکن ادریسی صاحب کہہ رھے ھیں کہ یہ ھندوستان ھے ۔ یہاں اظہار محبت ، اھانت ھے ۔ اور چال چلن کی کمزوری کی دلیل ھے ۔

مجیب :۔ میں آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ میرا ارادہ بالکل شریفانہ تھا ۔

پرنسپل :۔ مین کب کہہ رھا ھوں کہ تمہاری نیت خراب تہی ۔ سوال تمہارے ارادے کا نہیں ۔ سوال اس نتیجے کا ھے جو تمہارے ارادے سے پیدا ھوا ۔

مجیب :۔ میرا مقصد تہا .....اور اب بہی ھے کہ صرف...... شادی ...... میں نے ھرگز ...... میری مالی حالت مجھے طالب علمی کے زمانے میں شادی کرنیکی اجازت دیسکتی ھے ۔ میرے والد کو کوئی اعتراض نہیں ۔

پرنسپل :۔ یہ سب صحیح ۔ لیکن تم اس کے جذبات کا بہی تو خیال کرو جس سے تم نے محبت کا اظہار کیا۔ اگرچہ کہ عورتوں میں خود پسندی ھوتی ھے ۔ مگر ایک حد تک ....... تم نے بہت جلد بازی کی ........... تم اس لڑکی کو پہلے سے جانتے تہے ۔

مجیب :۔ صرف صورت آشنا تہا ۔ لیکن میں اسکی روح کی گہرائیوں سے اس قدر واقف ھوں کہ بڑے سے بڑا محرم راز بہی واقف نہیں ھوسکتا .......... محبت کی طاقت کا اثر ......

پرنسپل :— [ تیز لہجے میں ] اس قدر جوش میں آنے کی ضرورت نہیں ۔ اس کا خیال رکھو کہ تم میری موجودگی میں گفتگو کر رہے ہو ........ طالب علمی کا زمانہ سیکھنے کا زمانہ ہے ۔ تم کو آدمی بننا ہے ۔ تم کو آگے چل کر دنیا میں کچھ کرنا ہے ...... طالب علمی کا زمانہ عشق بازی کے لئے نہیں ..... آیا تمہاری سمجھ میں ........ تمہارے مقاصد بلند تر ہونا چاہئے ...... تم کو ابھی بہت کچھ حاصل کرنا ہے ۔ یہ تحصیل علم اور تحصیل انسانیت کا زمانہ ہے ...... کم از کم اسی لحاظ سے تم مجرم ہو ۔

مجیب :— جی ۔

پرنسپل :— اور اپنے جرم کی سزا تمکو معلوم ہے ؟ بہت سخت ۔ غالباً Rustication ..... ذاتی طور پر مجھے تم سے ہمدردی ہے ۔ مگر آئین و ضوابط بھی کوئی چیز ہیں ۔ کل کمیٹی میں تمہارے معاملے پر غور کیا جائے گا اور جس حد تک تمہاری خطا ثابت ہوگی ۔ تمکو سزا دی جائے گی ۔ اچھا (پروفیسر سے مخاطب ہو کر) ادریسی صاحب میں ایک چکر لگا کر ابھی آتا ہوں (اٹھتا ہے) آپ بھی چلتے ہیں ساتھ ؟

پروفیسر :— جی میں ابھی آیا (پرنسپل جاتا ہے ۔ پروفیسر، مجیب کی طرف رحم اور خلوص کی نگاہوں سے دیکھتا ہے) مجیب ۔

مجیب :— جی ۔

پروفیسر :— میں تمکو ہمیشہ تمہارے ساتھیوں پر ترجیح دیتا رہا ۔ تمہاری ذہانت سے میرے خیال میں ادب کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔ یہ تمکو کیا سوجھی ؟

مجیب :— (بے خیالی کے انداز سے) جی

پروفیسر :— تمہارا فرض ہے کہ اپنی ساتھی طالبات کو بہنوں کے برابر سمجھو تم نے بہت

برا کیا۔ تمہارا یہ طرز عمل ایک بڑی حد تک قابل اعتراض ہے۔

مجیب :— (توجہ کے ساتھ) میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ کوئی طاقت مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں اپنے دل کی کیفیت اسے تحریر کر دوں۔ اور اسکے بعد انتہائی شرافت سے شادی کی درخواست کروں۔ میں تخئیل میں بھی گناہ گار نہیں آپ کو معلوم ہے ہمیشہ مجھے نا زیبا باتوں سے کس قدر نفرت رہی ......

پروفیسر :— خیر محبت کا اظہار تو تمہاری عمر اور شباب کا تقاضا تھا۔ لیکن عقل اور سمجھ بھی کوئی چیز ہے۔

مجیب :— آپ کی عنایتوں کا بہت بہت شکریہ۔ کاش آپ کو معلوم ہو تاکہ میرے قلب میں عقل و محبت کا کتنا سخت معرکہ رہ چکا ہے۔ اور ........

پروفیسر :— وہی شباب کا بھوت — اچھا تمکو یہ معلوم ہے کہ تمہارا خط یہاں کیونکر پہونچا۔

مجیب :— آرورا کے والد یا منگیتر کے ذریعے۔

پروفیسر :— نہیں خود آروارا کے ذریعے۔ آس نے خود پرنسپل صاحب سے شکایت کی۔

مجیب :— (جسطرح کوئی زخم کھا کر بے نصبی کے احساس کے ساتھ چونک پڑے)۔ ارورا نے ؟

پروفیسر :— ہاں اسی آرورا نے جس سے تمکو محبت ہے۔ آسی نے یہ خط پرنسپل صاحب کو دیا اور شکایت کی اور تمہاری تباہی کا پیش خیمہ تیار کر دیا۔ (آگے بڑھ کر مجیب کے شانے پر ہاتھ رکھکر کہتا ہے) ابھی تمہارا بچپن ہے۔ تم نہیں جانتے کہ دنیا کیا بلا ہے۔

[ پروفیسر مجیب کی طرف رحم کی نظر سے دیکھکر چلا جاتا ہے، مجیب سر جکائے اکیلا کھڑا رہ جاتا ہے۔ چند لمحوں کے بعد آرورا داخل ہوتی ہے اور یہ دیکھکر

کہ آفس میں صرف مجیب ہے ٹھٹک جاتی ہے ۔ وہ واپس جانیکے لئے مڑتی ہے ۔ لیکن مجیب تیزی سے آگے بڑھ کر راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے]

آرورا :۔ میرا راستہ فورا چھوڑ دیجئے ۰۰۰۰۰۰ ورنہ میں چلاؤنگی ۰۰۰۰۰ کیا شرافت اسی کا نام ہے ؟

مجیب:۔[ کسیقدر افسردہ آواز میں لیکن جوش کے ساتھ ]میرا مقصد محض آپ سے ایک بات دریافت کرنا ہے ۔ آسکا جواب دیدیجئے ۔

آرورا :۔[ اسی قدر خفگی کے لہجے میں ] کیا ؟ جلدی کہئے ۔

مجیب:۔ آپ نے میرا خط پرنسپل کو کیوں لا دیا ۔ کسی نے مجبور کیا یا آپ خود لے آئیں ؟

آرورا :۔ ترشروئی سے] میں خود لائی ۰۰۰۰۰۰ کیونکہ [ انتہائی حقارت کے ساتھ ] مجھے تم سے نفرت ہے ۔

[ مجیب یک لخت کانپ اٹھتا ہے ۔ آرورا اسی بے پروائی سے چلی جاتی ہے ۔ مجیب کے چہرے سے انتہائی ناکامی اور ناکامی کے احساس کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑلیتا ہے ]

[ پردہ ]

# تیسرا ایکٹ

## پہلا منظر

[ کالج کی عمارت کے سامنے صحن میں کچھ طالب علم باتیں کرتے نظر آتے ہیں ۔ انکے ھاتھوں میں کتابیں ھیں ۔ ایک آدہ سیکل لئے ھوئے ھے ۔ ]

ایک :— آج کلاس تو غالبا نہوگی ۔ اکثر پروفیسر میٹنگ میں گئے ھوئے ھیں ۔

دوسرا :— میٹنگ کیسی ؟

ایک :— وھی کل والا قصہ ۔ مجیب صاحب نے آرورا کے نام ایک نامئہ محبت لکھا اور اسنے پرنسپل صاحب کو لیجا کر دیدیا ۔

دوسرا :— ارے رے ۔

اظہار عشق اس سے نہ کرنا تھا شیفتہ یہ کیا کیا ؟ کہ دوست کو دشمن بنا دیا

ایک :— اس میں کالج کی بدنامی ھے ۔ کو ایجوکیشن کے مخالفین کو تالیاں بجانیکا موقع مل جائیگا ۔

[ ابراھیم شملہ باندھے ھوئے کوٹ پہنے ھوئے آتا ھے ۔ آسکے ساتھ شمس الدین بھی ھے ]

ابراھیم :— السلام والیکم حضت

کئی طالبعلم :— وعلیکم السلام بزرگوار

شمس :— السلام وعلیکم یا جمیع الحاضرین ۔

ایک طالبعلم :— اجی کتنی مرتبہ وعلیکم السلام کہوں حضت ۔ اچھا [ اپنے پاس کے ایک طالبعلم سے ] آپ ان دونوں اصحاب سے واقف ھیں ؟ [ ابراھیم

کی طرف اشارہ کر کے ] آپ تازہ بتازہ نوبنو گاؤں سے تشریف لائے ھیں [ شمس الدین کی طرف اشارہ کر کے ] اور آپ کو یہاں آکر دو برس ھوگئے ھیں۔ اور دو برس سے آپ ھمارے شعبئہ فنون میں تعلیم پار ھے ھیں۔

ابراھیم :۔ اجی حضرت دس پندرہ منٹاں گذر گئے ابتک آپ لوگاں یا ئینچ کھڑے ھیں۔

ایک طالبعلم :۔ آپ کا انتظار کر رھے تھے۔ حضرت۔

ابراھیم:۔ اج میٹنگ ھے نا کتیں ؟ وہ چھوکری ھے نئیں جی سال چھارم میں۔ آرورا اسمائز بولتیں سو۔ میں سنا اس کو کوئی عاشقی کا خط لکھیا۔ اور انیں پرنسپل صاحب سے شکایت کی۔

شمس :۔ واللہ کہ کسقدر مھمل بلکہ لغو بلکہ لاغی اردو اپنی زبان سے ارشاد فرماتے ھو۔ جو بات کہ رگھائے لباں سے لبوں پر رونق افروز ھو اس میں انتھائی حلاوت و متانت و لطافت ھونا چاھئے۔ کس قدر کس درجہ بلکہ کس دقیقہ افسوس اور تاسف بلکہ تاسفات کی بات ھے یعنی افسوس کا محل ھے، تاسف کا مقام ھے کہ کلیۂ دارالعلوم والفنون میں پڑھنے کے باوجود صحیح و فصیح و ملیح زبان میں اپنی قوت گویائی نہیں صرف کرسکتے۔ حیف صد حیف۔ فاعتبرو یا اولا البصار۔

ابراھیم :۔ اجی کیا ٹخ ٹخ لگائیں حضت۔ تمھارے کو کیا آتا جاتا چپچ دوسروں کو بولتیں حضت۔

ایک طالبعلم :۔ اجی بزرگوار میں نے سنا ھے کہ ارورا کو اپ ھی نے خط لکھا ھے۔

ابراھیم:۔ میں ؟ اجی نہیں حضت۔ کون بولیا بھلا اپ سے۔ یہ جوتے کھانیکی باتاں ھیں۔ میرے کو بھلا عاشقی کر کے کیا کرنے کا ھے۔

دوسرا:— نہیں ابراهیم صاحب نوٹس بورڈ پر تو اپ هی کا نام هے۔ پرنسپل صاحب تو اپ هی سے بہت ناراض هیں۔

ابراهیم:—[خوفزده هو کر] اجی سچی کیا جی حضت۔ پر میں خسم کھا توں۔ جسکی بولے اسکی خسم کھا توں۔ میں پکه بہی نہیں بولیا۔ کوئی تو بہی میری دشمنی میں جا کو بولیا هوگا۔

[سب هنستے هیں]

شمس:— افسوس اور تاسف اورصدافسوس اور صد هزاروں افسوس براین جهالت و این نا سمجهی۔ اے مرد عاقل خدا نے تجهے نعمت تمیز سے مالا مال فرمایا هے۔ پس تیرا فرض بلکه فرض العین یه هے که اپنے عقول کو کام میں لا۔ فاعتبروا یا اولا البصار (جاتا هے)

ایك طالبعلم:— واه خدا کے فضل سے همارے یہاں ایك سے بڑه کے ایك بزرگ موجود رهتے هیں۔ [سب هنستے هیں]

[وسیم صاحب داخل هوتے هیں جن کو پہلا خیال یه هوتا هے که سب لوگ مجهه پر هنس رهے هیں۔ ان لڑکوں سے بچکر گذر جانےکی کوشش کرتے هیں۔ مگر ان میں سے ایك پکارتا هے]

طالبعلم:— اجی آداب عرض هے وسیم۔ هم لوگوں نے کیا گناه کیا۔

وسیم:— معاف کرنا ...... جی صاحب ...... جی صاحب [وسیم صاحب بےترشی سے هر ایك سے هاته ملاتے هیں۔ اور اسی کوشش میں ان کی کتابیں زمین پر گرپڑتی هیں جن کو وه بڑی کوشش سے فراهم کرنے اور اٹهانیکے لئے جهکتے هیں۔ لڑکے هنستے هیں تو وسیم صاحب فی البدیه یه مصرع پڑه کر

جھنیپ مٹانے کی کوشش کرتے ھیں - ]

کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری

[ ظفر اور وحید آتے ھیں - بالکل آھستہ اور بڑے اطمینان کے ساتہ ]

ظفر :- آداب عرض ھے - آ - آ - آ - آ - آداب عرض ھے جناب وسیم صاحب ( ظفر ھرایک سے ھاتہ ملاتا ھے اور وحید بہی اس کے ساتہ ) کیا قصہ ھے بھئی - وسیم صاحب آپ خیریت سے تو ھیں ؟

وسیم :- کیوں، خیریت سے ھوں کیا معنے ؟ ظفر صاحب کاش آپ میں ذرا انسانیت ھوتی ۔۔۔۔۔۔ جی صاحب -

ظفر :- دعا کیجئیے - دو رکعت نماز کی منت مانئیے -

وسیم :- کیوں ۔۔۔۔۔۔

ظفر :- تاکہ آپ کو تہوڑی عقل اور مل جائے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا ھمارے وحید صاحب آپ نے سنا ھمارے وسیم صاحب شاعر بہی ھیں -

وحید :- اچھا -

ظفر :- یہ آپ ھی کا مصرع ھے - کوا اندھیری رات میں دن بھر اڑا کیا (سب ھنستے ھیں)

وحید :- واہ وسیم صاحب واہ -

وسیم :- ارے اس کی باتیں کیا سنتے ھو جی - میں اور ایسے مہمل شعر لکھوں -

ظفر :- وسیم صاحب آپ ناحق اس قدر انکساری کر رھے ھیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھا وحید صاحب اور سنئیے ھمارے وسیم صاحب کا تازہ ترین شعر یہ ھے -

اغیار بنڈے پھینک کے مارین نہ اے وسیم معشوق کی گلی میں سگ دم بریدہ ھوں

[ سب لڑکے بڑے زور سے ھنستے ھیں - وسیم صاحب بگڑ کر کھتے ھیں ] -

وسیم :- لعنت اللہ علی الکاذبین -

[ چپراسی گذرتا ھے ۔ ظفر پکارتا ھے ]

ظفر :۔ چپراسی او چپراسی ہمارے لئے ایک گلاس مین پانی ۔ ٹھنڈا پانی ۔ جلدی لاو

[ آخری الفاظ حلق سے نکال کر مسخرےپن سے ادا کرتا ھے ۔ چپراسی جاتا ھے ]

وحید :۔ اچھا بھئی وہ قصہ کیا ھے ۔ میں نے سنا ھے کہ مجیب صاحب نے آرورا سے اظہار محبت کیا اور اس نے پرنسپل صاحب سے شکایت کی ۔

ابراهیم :۔ [ دفعتاً بہت غصے سے ] دیکھیے حضت دیکھیے آپ ۔ چیچ آپ میرے کو بولے تہے ۔ مجیب صاحب تو ھیں کتے ، آپ میرے کو ییچ بول رھے تہے ۔ بڑے شرم کی بات ھے حضرت ۔ [ سب ھنستے ھین ]

ظفر :۔ [ ھنستے ھیں ] کیا قصہ ھے بھئی ؟

ایک طالبعلم :۔ یہ ابراهیم صاحب بھی ارورا کے عاشقوں میں ھیں ۔

ظفر :۔ واہ سبحان اللہ کیا عاشق دل پھینک ھیں ۔ وسیم صاحب اب آپ بھی عاشقی شروع کردیجئے ۔ بسم اللہ ۔ آپ بھی صورت ھی سے غبی اور کند ذھن آدمی معلوم ھوتےھیں ۔

وسیم :۔ [ غصّے سے ] بس جناب سمجھے آپ ۔ ذرا شرافت کی باتیں کیجئے ۔

ظفر :۔ اسکے آگے یہ بھی توکھد یجئے کہ نہ ھوی قرولی ورنہ بتادیتے گیدی کو۔۔وسیم صاحب آپ میں اورنوجی مین کتنا فرق ھے ۔

وسیم :۔ جتنا مجه میں اورآپ میں ھے [ پھراس جملہ پر ھنسنے کی کوشش کرتا ھے ۔ لیکن سب کو خاموش دیکھکر خاموش ھوجاتا ھے ۔ چپراسی ظفرکو پانی لا دیتا ھے ۔

ظفر کچه پی لیتا ھے ۔ پھر مڑکر آھستہ سے وسیم کے پیچھے جاکر شیروانی کے کالر کے اندر پانی ڈال دیتا ھے ۔ وسیم تقریبا اچھل پڑتا ھے ۔ کتابیں زمیں پرآکر منتشر ھوجاتی ھیں ، سب لڑکے ھنسنے لگتے ھیں ۔ وسیم کی غصے میں یہ حالت

ہوتی ہے کہ کچھ دیر تک خاموش رہتا ہے۔ پھر زمیں سے ایک کتاب اٹھا کر ظفر کو کھینچ کر مارتا ہے۔ ظفر ہٹ جاتا ہے۔ اور کتاب کچھ دور جا کر گرتی ہے۔ اس پر پھر وہی قہقہہ شروع ہو جاتا ہے]۔

وحید :- ارے بھئی ظفر ناحق بچارے کو ستاتے ہو۔

وسیم :- اجی ستانا کیا معنی حضرت۔ جی صاحب ..... یہ بھی کوئی شرافت ہے .... جی صاحب ...... یہ بھی کوئی انسانیت ہے۔ ابھی جا کر پرنسپل صاحب سے شکایت کرتا ہوں (لڑکے کتابیں اٹھا دیتے ہیں۔ جنکو لیکر وسیم جاتا ہے۔ سب لڑکے پھر ہنسنے لگتے ہیں)۔

وحید :- نیک آدمی ہے بچارا۔ جانے بھی دو بچارے کو۔
اچھا بھئی اب چلنا چاہیئے۔ یہاں بیکار ٹھہرنے سے کیا حاصل؟

ظفر اور طالب علم۔ اچھا چلئے۔ [جاتے ہیں۔ پردہ گرتا ہے]۔

## دوسرا منظر

[مجیب کے مکان کا ایک کمرہ۔ بیچ میں۔ میز پر کتابیں انتہائی بے ترتیبی سے پھیلی ہوئی ہیں۔ چند قیمتی کرسیاں ادھر ادھر پڑی ہوی ہیں۔ مجیب ٹہلتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر سر کے بال پریشان اور الجھے ہوئے۔ وہ بالکل گھر کے روزمرہ لباس میں ہے۔ لیکن قمیض ایک آدہ جگہ سے پھٹا ہوا۔ وہ تیزی سے ٹہلتا ہے۔ اور اسکی رفتار تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ چند چکروں کے بعد یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ وہ دوڑنے لگے گا۔

اسی اثناء میں اسکے بہائی حبیب احمد صاحب اندر داخل ہوکر کچھ دیر تک دروازے کے سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ حبیب صاحب بہت اچھے لباس میں ہیں۔ اپنے لڑکے کی یہ حالت دیکھکر ان کے رنج کا ان کے چہرے سے اظہار ہوتا ہے۔ وہ پکارتے ہیں "مجیب"۔ مجیب اسطرح ٹھٹک جاتا ہے جیسے کوئی خواب سے چونک پڑے۔ حبیب احمد اسکے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں اور پھر اسے قریب ترین کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ اور ایک کرسی قریب کھینچ کر اس پر بیٹھ جاتے ہیں]

حبیب :۔ مجیب یہ تم نے کیا اپنی گت بنائی ہے۔ [مجیب اسکی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا ہے]

مجیب :۔ اپنی گت۔ بالکل نہیں۔ کل سے میں یہ سمجھنے لگا ہوں کہ میں دنیا میں ہوں۔

حبیب :۔ تمہارے بال پریشان اور الجھے ہوئے ہیں۔ تمہارے کپڑے پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ کیا ہیئت ہے۔

مجیب :۔ مجھے خود نہیں معلوم بس اتنا خیال ھے کہ جب پرنسپل صاحب کے یہاں سے میں گھر واپس آ رہا تھا۔ تو میرے قلب میں ایك هیجان سا بپا تھا۔ رات کو مجھے مطلق نیند نہیں آئی۔

حبیب :۔ میں تمکو ملامت نہیں کرتا۔ میں جانتا هوں کہ تمہاری عمر میں جذبات کی اهمیت کسقدر زیادہ هوتی ھے۔ جذبات کی تیزی کے آگے تم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن تمہاری سمجھ داری سے مجھے اسکی توقع نہ تھی۔ اس سے اگر شادی نہ هو سکی تو اور بھی هزاروں لڑکیاں هیں۔ یہ رنج وغم تم کو هرگز زیب نہیں دیتا۔

مجیب :۔ اگر میری جگہ آپ هوتے۔

حبیب :۔ بیشك اگر تمہاری جگہ میں هوتا تو میں بھی یہی محسوس کرتا جو تم کر رھے هو۔ مگر میرا وہ زمانہ گزر کر مدتیں هو گئیں۔ تجربے اور دنیا نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

[صالح داخل هوتا ھے۔ اور دروازے کے قریب حیران هو کر رك جاتا ھے۔ اسکی نظریں مجیب پر رك جاتی هیں اور پھر حبیب پر پڑتی هیں۔ حبیب کو وہ جھك کر سلام کرتا ھے]

حبیب :۔ آؤ۔ آؤ میاں صالح آؤ۔ دیکھو مجیب نے اپنی کیا حالت بنائی ھے۔ تم هی سمجھاؤ ــ میں ابھی چند منٹ میں آتا هوں [حبیب اٹھکر جاتا ھے اور اسکی خالی کرسی پر صالح بیٹھ جاتا ھے]

مجیب :۔ صالح تمہارے یہاں آنے کا بہت بہت شکریہ۔ میں نے تم سے جو سخت کلامی کی تھی اسکی معافی چاھتا هوں۔ جو شخص تمہارے ایسے دوست پر اعتماد نہ کرے اسکے جنون میں کوئی شبہ نہیں۔

صالح :— نہیں۔ اس موقع پر تم نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک تھا۔ اسوقت تک تمکو نیک و بد کی کوئی تمیز نہ تھی۔ لیکن تم نے اب میرے مشورے کی اہمیت کو محسوس کیا ہوگا؟

مجیب :— بہت اچھی طرح سے۔

صالح :— اور تم نے دنیا کے انصاف کا معیار دیکھ لیا۔ اگر تم چالاکی اور مکاری سے اس لڑکی کو حاصل کرتے تو نہ یہ جھگڑے ہوتے نہ شکایت ہوتی۔ نہ رسٹیکیشن کا قصہ درپیش ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ بدنامی ہوتی۔ تو اس صورت میں کیا کم بدنامی ہے۔ اب پاس عزت کا نتیجہ تم نے دیکھ لیا —— رسٹیکیشن۔

مجیب :— ہاں بہر حال اب تو میرا مستقبل بالکل تباہ و برباد ہوگیا۔ صالح تم جانتے ہو گے کہ پہلی محبت میں ناکامی کسی قدر تلخ ہوتی ہے ......... اسکے علاوہ تعلیم برباد۔

صالح :— اگر تم غور کرو تو کوئی چیز برباد نہیں —— محبت تو بچوں کا کھیل ہے۔ پانسہ تمہارے خلاف پڑا تم ہار گئے —— بس اب بچوں کی طرح رونا کیسا۔ باقی رہی تعلیم اس یونیورسٹی میں نہ سہی کسی اور یونیورسٹی میں سہی۔

مجیب :— تم کو یہ چیزیں بہت معمولی معلوم ہو رہی ہیں۔ لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ خود آرورا نے پرنسپل صاحب سے شکایت کی تو یقین جانو میں نے محسوس کیا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک طرف محبت ہو اور دوسری طرف انتہائی نفرت۔ پرنسپل صاحب کے کمرے میں اتفاقاً آرورا سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اسکی ہر بات ہر حرکت سے محسوس کیا کہ اسکو مجھ سے سخت نفرت ہے۔

صالح :— خیر اب جو گذر چکا گذر چکا۔۔۔۔۔اب غالب کے کہنے پر عمل کرو۔۔۔۔

وحشت بقید چاك گریبان روا نہیں۔

یہاں سے تم بالکل عملی آدمی بن جاؤ۔ عقل سلیم کو اپنا رہنما بناؤ اور جذبات کی پیروی کبھی مت کرو۔ ورنہ جذبات پھر اس مرتبہ کی طرح کسی خندق میں لیجا کر گرادیں گے۔

مجیب :— هوں۔۔۔۔۔۔

صالح :— هر انسان کا جہاں ایك مستقبل ہوتا ہے۔ وہاں ایك ماضی بھی ہوتا ہے۔ ابتك تمہارے سامنے مستقبل تھا۔ اب یہاں سے تمہارے پیچھے ایك ماضی شروع ہوتا ہے۔ هر شخص پر یہی گذرتی ہے۔ تم آج جس مصیبت میں مبتلا ہو۔ اب سے پہلے میں بھی ان مصیبتوں میں مبتلا رہ چکا ہوں۔

مجیب :— بیشك صالح دنیا میں هر شخص کو کوئی نہ کوئی مصیبت دی جاتی ہے۔ مجھے حسرت رہ گئی کہ آج تك کوئی ایك شخص تو ایسا ملتا جو کامل مسرت اور خوشی سے زندگی بسر کرتا ہو۔ مگر هر شخص۔۔۔۔۔۔۔۔هر شخص کا چہرہ مصیبتوں اور ناکامیوں کی ایك زندہ دستاویز ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایك ہیں   موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔

صالح :— یقیناً اس حد تك تمہارا خیال بالکل صحیح ہے کہ خدا نے هر شخص کو بے انتہا آلام و مصائب عطا کئے ہیں۔ مگر اس سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہی آلام و مصائب یہی ناکامیاں زندگی کو حقیقی شان عطا کرتی ہیں۔ انسان کی روح اسیوقت جلا پاتی ہے جب اس پر پیہم مصیبتیں پڑتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔دنیا کے تمام بڑے بڑے رہنماؤں کی زندگی کو لے لو۔ ان میں سے هر ایك کی زندگی مصیبتوں کا

ایک گہوارہ ہے۔ یہ سب نطرت کے قوانین ہیں۔ نطرت کی سختیاں محبت کو چھپائے ہوئے ہیں۔

مجیب :۔ یہ سب صحیح۔ لیکن جب مصیبت پڑتی ہے، تب اسکی تلخی کے سوا دنیا کی اور کوئی چیز یں نظر نہیں آتی۔ دنیا کی ہر چیز تلخ اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہے۔ اسوقت کی دماغی کیفیت خدا دشمن پر بھی طاری نہ کرے۔

صالح :۔ یہ دلکی کزوری ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اگر وہ شکست کھائے بھی تو شکست کا اعتراف نہ کرے۔ اس سے اسکی قوت عمل بر قرار رہتی ہے۔ مجیب زندگی کی مصیبتوں کو راحت سمجھ کر قبول کرنا چاہیئے۔ ان سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ یہ کامرانی اور کامیابی کی نشانی ہے۔

مجیب :۔ یہ سب صحیح ۰۰۰۰۰۰لیکن صالح ۰۰۰۰۰ [چہرے سے انتہائی قلبی اذیت کا اظہار کرتے ہوئے] میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا دماغ بے قابو ہے ۰۰۰۰۰۰ یہ زندگی کا پہلا موقع ہے ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰غالباً یہ جنون نہیں؟۰۰۰۰۰

صالح :۔ جنون؟۰۰۰۰۰۰جنون ہرگز نہیں۔ یہاں سے تمہاری زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ یہ تمہاری زندگی کے ایک موسم کی تبدیلی کی نشانی ہے ۰۰۰۰۰تمہاری موجودہ ذہنی کیفیت ایک گذرتی ہوئی تیز ہوا ہے۔ جسکے گذرجانیکے بعد دماغ پھر امن و سکون سے آرام پانے لگے گا۰۰۰۰ سمجھے ۰۰۰۰۰اچھا اب اپنی محبت کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟

مجیب :۔ [چہرے سے تکلیف کا اظہار اور حرکات و سکنات سے بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے] ایک خوفناک خواب

[جیب دوبارہ اندر داخل ہوتا ہے۔ اس سے ایك قدم پیچھے وحید بہی آتا ہے۔ جیب کے چہرے سے متانت و سنجیدگی اور وحید کے چہرے سے مسرت کا اظہار ہوتا ہے]

مجیب :۔ مجیب تمہارے دوست وحید صاحب آئے ہیں۔ اور تمہیں ایك خوشخبری سنائیں گے۔

[مجیب کچه کہنا چاہتا ہے ........ لیکن وحید جلدی سے آگے بڑھکر کہتا ہے]۔

وحید :۔ مبارك مجیب تمہارے رسٹیکیشن کی تجویز مسترد ہوگی [مجیب حیرت وحسرت کی ملی جلی نظروں سے اسکی طرف دیکھتا ہے]۔

صالح :۔ کیا ؟

وحید :۔ میٹنگ میں بڑی زبردست بحث ہوئی۔ بالاخر تمہارے حق میں فیصلہ ہوا۔ رسٹیکیشن کی تجویز مسترد ہوگی۔

[صالح ایك اطمینان کی سانس لیکر کرسی کا سہارا لگا کر آرام سے بیٹھتا ہے۔ مجیب وحید کی طرف کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے پھر رفتہ رفتہ مسرت کے جذبات اسکے چہرے سے ظاہر ہونےلگتے ہیں]۔

حبیب :۔ [مسکرا کر پہلے مجیب سے اور پھر صالح سے مخاطب ہوکر] ایك عجیب تربات یہ ہیکہ ابہی ابہی آروراا سبا ئلز کی ایك چٹھی مجھے ملی۔ جس میں مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی ............۔

[سب کے سب تعجب کی نظروں سے اسکی طرف دیکھنے لگتے ہیں]۔

حبیب :۔ اور میں نےجواب میں لکھدیا کہ اسوقت میں گھر ہی پر ہوں اور وہ یہاں آکر مجھ سے مل سکتی ہیں۔ غالباً کچھ دیر میں وہ یہاں آجائیں گی۔

[مجیب کے چھرے سے پے در پے مسرت، تعجب اور پریشانی کا اظھار ھوتا ھے۔ صالح تعجب سے حبیب کی طرف دیکھنے لگتا ھے، جو مجیب کی کرسی پر ایک ھاتھ رکھے کھڑا ھے۔ کچھ دیر تک خاموشی طاری رھتی ھے۔ اور حبیب باھر چلا جاتا ھے۔ مجیب کی آواز اس خاموشی کو توڑتی ھے]۔

مجیب :۔ واقعات کس تیزی سے پے در پے رنگ بدل رھے ھیں۔ میرا دماغ بالکل بیکار ھوتا جا رھا ھے چوبیس گھنٹے کے قلیل عرصے میں حالات کس تیزی سے بدلتے جا رھے ھیں (وہ بیٹھے بیٹھے آگے کی طرف جھکتا ھے اور دونوں ھاتوں سے اپنا سر پکڑ لیتا ھے)۔

وحید :۔ مجھے خود انتہائی حیرت ھو رھی ھے۔

صالح :۔ حیرت کی کوئی بات نہیں۔ محبت اور نفرت کے جذبات باھم اسقدر ملے جلے ھیں کہ اکثر وہ آپس میں بدلتے جاتے ھیں۔ اور پھر عورتوں کی طبیعت کا تلون تو معلوم ھی ھے۔

وحید :۔ محبت اور نفرت کے جذبات کی یکسانی میری سمجھ میں نہیں آتی۔

صالح :۔ محبت کی طرح نفرت بھی ایک تعلق ھے۔ نفرت اور بے تعلقی میں زمین و آسمان کا فرق ھے۔ اگر نفرت ھی ھو تو وہ بھی ایک تعلق ھے۔ غالب کا وہ شعر ھے نہیں؟

وارستہ اس سے ھیں کہ محبت ھی کیوں نہو کیجئے ھمارے ساتھ عداوت ھی کیوں نہ ھو

ھمارے شعراء میں زندگی کو سب سے زیادہ غالب ھی سمجھ سکا اور یہاں اس شعر سے بھی یہی مطلب ھے۔ عداوت اگرچہ کہ منفی تعلق ھے لیکن تعلق ضرور ھے۔ اگر ھمکو کسی چیز کی ممانعت میں دلچسپی ھے۔ تو اسکے معنی یہ ھیں کہ ھمکو اس چیز سے دلچسپی ھے۔ اور بسا اوقات یہ ھوتا ھے کہ ھماری دلچسپی رخ بدل دیتی ھے۔ یعنی بجائے اسکی مخالفت

میں دلچسپی لینے کے خود اس چیز سے دلچسپی ہوجاتی ہے۔ اسطرح نفرت، محبت سے بدل جاتی ہے۔

وحید:— ٹھیک ہے اور غالبا یہی قصہ یہاں بھی در پیش ہے۔

صالح:— بالکل یہی۔

وحید:— مگر واہ تاسف بھی ہوا تو کب۔

کی مرے قتل کے بعد اسنے جفا سے توبہ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

[حبیب تیزی سے قدم اٹھاتا اندر آتا ہے۔ صالح اور مجیب دونوں سے مخاطب ہوکر کاروباری اور رازدارانہ لہجے میں باتیں کرتا ہے]۔

حبیب:— وہ لڑکی یہیں آ گئی ہے۔ میں اس سے باتیں کر رہا تھا.........

مجیب:— ہوں۔

حبیب:— اس کی گفتگو سے اس کا منشا کسی نہ کسی طرح معلوم ہوگیا۔ وہ اپنے کئے پر متاسف ہے کہ اس کی وجہ سے مجیب کو اس درجہ ذہنی اور قلبی تکلیف ہوئی رسٹیکیشن کی تجویز کے مسترد ہوجانیکا قصہ سنکر وہ بہت خوشی ہوئی۔

صالح:— جی۔

حبیب:— وہ اپنے کئے پر متاسف ہے۔ اور باوجودیکہ اس نے صاف الفاظ میں نہیں کہا تاہم اس نے اپنا مافی الضمیر ادا کر دیا کہ تلافی مافات کے لئے وہ مجیب سے شادی کرلینے پر تیار ہے...............

[مجیب چونك پڑتا ہے۔ اور کرسی کے بازو کا سہارا لیکر اٹھکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ حبیب اس کے شانے پر ہاتھ رکھکر پھر اس کو بٹھا دیتا ہے]۔

حبیب :— میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ خود مجیب سے اس معاملے
میں گفتگو کرلے [صالح اور وحید سے] چنانچہ آپ دونوں دوسرے
کمرے میں تشریف رکھئیے۔ میں آرورا کو یہیں بلائے لیتا ہوں۔

[صالح اور وحید جاتے ہیں اور ان کو پیچھے حبیب۔ایک لمحے تک کامل
خاموشی میں مجیب تنہا رہتا ہے۔اس کے بعد حبیب آرورا کے ساتھ واپس آتا ہے]۔

حبیب :— (اورورا سے معذرت کے لہجے میں) اس کمرے کی ظاہری حالت دیکھکر
آپ کو تکلیف ہو رہی ہوگی لیکن کل سے ۰۰۰۰۰۰ کل سے ۰۰۰۰۰۰۰۰۰
(آرورا کے چہرے کا رنگ فق ہوجاتا ہے) میرا مطلب ہے کہ مجیب کی
طبعیت ذرا پریشان رہی۔ اور اسی وجہ سے سامان اس قدر تتربتر ہے۔

رورا:— [آسان اور کمزور لہجے میں] جی کوئی بات نہیں۔

حبیب:— میں سمجھتا ہوں کہ میری موجودگی ضروری ہے۔

آرور:— جی۔

حبیب :— معاف کیجئیے گا مس اسمائلز بھائی ہونیکی حیثیت سے مجھ پر چند اہم ذمہ داریاں
عاید ہوتی ہیں۔ باوجود اس کے مین نے اپنے بھائی کو بہت زیادہ آزادیاں
دے رکھی ہیں۔ پھر بھی میرے کچھ فرائض ہیں۔

آرورا :— جی۔

حبیب :— [اکتا کر] میری وجہ سے آپ مطلق تکلف نہ کیجئیے۔ جو کچھ آپ کو کہنا
ہے مجیب سے صاف صاف بیان کردیجئیے۔ [حبیب کمرے کے انتہائی سرے پر
ایک کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اور مشغلتاً ایک کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگتا ہے]۔

مجیب :— میں اسمائلز میں آپ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

آرورا :— مطلق نہیں [ اس کے چھرے سے جذبات کی رقت کا اظہار ہوتا ھے ] میں
یہاں ایک خاص بات کھنے آئی تھی ۔

مجیب :— جی کیا ؟

آرورا [پہلے کچھ ھچکچاتی ھے ۔ اس کے بعد کھتی ھے ] کیا آپ میرے نا خوشگوار طرز عمل
کو معاف فرمائیں گے ۔

مجیب :— آپ کا طرز عمل ھرگز نا خوشگوار نہ تھا ۔ آپ نے وھی کیا جو آپ کو کرنا
چاھئے تھا ۔

آرورا :— ھرگز نہیں ۔ میں جانتی ھوں اپ کو کس قدر قلبی اذیت ھوئی ھوگی ۔ یقین
مانئے مجھے یہ سنکر بڑی مسرت ھوئی کہ آپ کے رسٹیکیشن کی تجویز مسترد
ھو گئی ۔

مجیب :— آپ کا بہت بہت شکریہ ۔

[ اس کے بعد خاموشی چھا جاتی ھے ۔ ارورا کچھ کھنا چاھتی ھے مگر نہیں
کہہ سکتی ۔ حبیب اس حالت کو محسوس کر کے اپنی جگہ سے اٹھتا ھے ] ۔

حبیب :— مس اسمائاز میرا خیال ھے کہ آپ جو کچھ کھنا چاھتی ھیں ۔ اس کو ادا کرنے
میں آپ کو زحمت ھو رھی ھے ۔

[ آرورا سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیتی ھے ] ۔

حبیب :— غالباً میں آپ کا ما فی الضمیر ادا کر سکوں گا ۔ میرے خیال میں آپ یہ
بولنا چاھتی ھے کہ آپ کو مجیب کی درخواست منظور ھے ؟

[ آرورا کے چھرے سے شرم اور سنجیدگی کا اظھار ھوتا ھے ۔ سر کے
اشارے سے وہ پھر اثبات میں جواب دیتی ھے ]

حبیب :— [ نرم لهجے میں سنجیدگی سے ] جسکا مطلب یه هے ...... که آپ مجیب سے شادی کرنے پر آماده هیں

[ اس پیهم اصرار پر آرورا کے چهرے سے تهکن کا اظهار هوتا هے ۔ اور وه آهسته سے ,, هاں ،، کهتی هے ۔ مجیب اس اثناء میں برابر جمی هوئی نظروں سے سکی طرف دیکھتا رهتا هے ] ۔

مجیب :— مس اسما ئاز کیا میں دریافت کرسکتا هوں که میرے بهائی نے جو الفاظ کهے وه اپکے ما فی الضمیر هیں ؟

آرورا :— [ پہلے کسیقدر مسکراکر پهر مستعدی سے صاف صاف پیرایے میں ] جی هاں ...... میرا خود بولنا ضروری هے غالباً مجهے صاف صاف الفاظ میں یه کهه دینا چاهئے که میری وجه سے آپ کو جو تکلیف هوئی مجهے اسکا احساس هے اور تلافی مافات کا ذریعه یهی هے که آپ نے جو تحریك کی تهی اسے میں ............... مان لوں ۔

مجیب :— [ اپنی ساری سراسیمگی اور بدحواسی چھوڑ کر انتهائی صاف اور واضح پیرائے میں ] مس اسما ئاز آپ کی اس عنایت کا بهت بهت شکریه ۔ اگر چوبیس گهنٹے قبل میں آپ کی زبان سے یه الفاظ سنتا تو غالباً مارے خوشی کے زنده نه ره سکتا ۔ لیکن اس چوبیس گهنٹے کے عرصے میں میرے ذهن نے خوفناك ترقی کی هے ۔ میں یه محسوس کررها هوں که میری عمر میں دفعتاً کئی سال کا اضافه هوگیا هے ۔ مجهے خود اپنی پہلی کیفت پر تعجب هوتا هے ...

[ آرورا کا چهره خلاف توقع جواب سنکر حیرت کی تصویر بنکرره جاتا هے ۔ پهر بهی گفتگو کے آخری حصه اور انجام سننے کا اشتیاق اسکے چهرے سے ظاهر هوتا هے ۔ حبیب دونوں هاته جیب میں رکهکر مجیب کی طرف متعجب نظروں سے دیکھتا هے ۔

مجیب یه الفاظ ادا کر کے ایک دو سکنڈ کے لئے ٹھہرتا ھے ۔ اور اسکے بعد انتہائی غمناک لہجے میں وہ آخیری الفاظ ختم کرتا ھے ]۔

مجیب :— میرے ذھن کو صدمہ پہنچا وہ اسقدر خلاف توقع اور اسقدر سخت تھا کہ میری قوت احساس تقریباً ختم ھوگئی ۔ آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ ۔ لیکن میں اب ایک ایسا انسان ھوں جسکا دماغ ٹوٹی ھوئی کشتی کی طرح سمندر کی لھروں کے رحم پر ھو ۔ اس ٹوٹی ھوئی کشتی پر کسیکو بٹھانا اسکی زندگی کو خطرے میں مبتلا کرنا ھے ........ دوسرے الفاظ میں میری ذھنی کیفیت اسکی اجازت نہیں دیتی کہ میں آپ کی عنایت سے فائدہ اٹھا سکوں ۔

حبیب :— [ انتہائی تعجب کے لھجے میں ] اسکے معنی یہ ھے کہ تم شادی سے انکار کر رھے ھو۔

مجیب :— جی ھاں [ آرورا سے ] مس اسمائلز مجھے بہت افسوس ھے کہ میں آپ کے جذبات کو صدمہ پہنچا رھا ھوں ۔

آرورا :— [ جسکا چھرہ بالکل زرد ھے ۔ بہت پست آواز میں کھتی ھے ] مطلق نہیں [ اور پھر وہ جانیکے لئے مڑتی ھے ۔ حبیب اسکے ساتھ باھر تک جاتا ھے اور پھر واپس آجاتا ھے ۔ مجیب ایک گھری سانس لیکر اٹھ کھڑا ھوتا ھے ۔ اور ٹھلنے لگتا ھے ۔ حبیب اسکی طرف دیکھتا رھتا ھے ]

[ اور اسی حالت میں چند خاموش لمحے گذر جاتے ھیں ۔ پھر پردہ گرتا ھے ]

*Nos. 2 and 3.*



*No. 4.*

## *No. 2.*



## *Nos. 3 and 4.*



## *Vol. III, No. 1.*

## *Vol. I, No. 1.*



## *Nos. 2 and 3.*

# SUCCESSION

## LIST OF EDITORS

(*a*) *The English Section.*

1. MR. S. FAZLE HAQ, B.A. (*a*).
2. ,, M. ABDUL JALIL, B.A. (*b*).
3. ,, M. A. QAYYUM KHAN, M.A. (*c*).
4. ,, MEHDI ALI SIDDIQI, M.A., LL.B. (*d*).
5. ,, B. N. CHOBE, B.A.

(*b*) *The Urdu Section.*

1. MR. S. GHULAM MOHIUDDIN QADRI, B.A. (*e*).
2. ,, S. MOINUDDIN QURAISHI, B.A. (*f*).
3. ,, M. JALALUDIN, B.A., LL.B.
4. ,, S. M. AKBAR WAFAQANI, B.A. (*g*).
5. ,, SHAIKH CHAND, B.A. (*h*).
6. ,, NABIUL HASAN, B.A. (*i*).
7. ,, GHULAM DASTAGIR, B.A. (*j*).
8. ,, S. M. MURTUZA, B.A.
9. ,, RAZA HUSAIN KHAN, B.A.

(*a*) M.A., Lecturer, City Intermediate College, (*b*) Finance Office, (*c*) Research Scholar, (*d*) H. C. S., (*e*) M.A., Ph.D., Assist. Prof., O. U. C., (*f*) M.A., Headmaster, Asafia High School, (*g*) President, Historical Soc., (*h*) M.A., (*i*) Tahsildar, (*j*) Research Scholar.

# EDITORIAL

IT is, we believe, the first occasion since the editorship of Mr. Abdul Jalil that it has been possible to bring out five issues of this section of the magazine in one year. It has been a very pleasant duty, and now we take leave of our readers, offering a few suggestions based on our experience.

We think that the work involved in editing the English section might be divided, on the lines indicated in our issue Vol. V, Nos. 1 and 2, between an editor and a sub-editor, the latter to be selected on the recommendation of the former.

While the Urdu section was being printed in lithograph there might have been reason to keep it double the size of the English section; but now, when both sections appear in type, there can hardly be any justification for this. The number of pages thus saved might be equally distributed between the three vernaculars of Hyderabad not represented in the magazine,—Marathi, Kanarese and Telugu. Sufficient space should be allotted to allow each to have an opportunity to contribute on equal terms with Urdu and English.

---

Of the prizes announced in Vol. IV, No. 4, Prof. E. E. Speight's prize goes to Mr. Syed Vahiduddin, B.A. for his article on Psychical Research which was adjudged the best article during the year.

As we did not receive any article for the special competition announced in the same issue, it is now closed.

In conclusion we have to thank those of our friends who have transformed our labour of love into a lovable labour.

B. N. CHOBE.

PRINTED AT THE DIOCESAN PRESS, MADRAS, 1932—C5705

with mysticism. Their growing tendency to do away with form and to emphasise the content is highly mystical in character. 'How does it come about? When a person who calls himself *I* and refers to himself as *My* or *Me* ponders deeply and earnestly (i.e. contemplates) on who or what, how and why I am, he is bound to arrive at some answers to such questioning of himself. If and when he thinks that those answers are correct and satisfactory, he has a conviction, and this conviction puts his mind into a certain attitude I call Tasawuf, whether Vedantism or Sufism'. But this ignores the important difference between a philosopher and a mystic. While one builds a coherent system and reaches conclusions by a process rationalistic through and through, the other finds the Reality by means of self-purification, self-mortification and intuitive insight. It is sometimes difficult, however, to draw a line of demarcation. The mystical elements in the philosophy of Plato and Bergson are, indeed, preponderating. There are so many sweeping generalisations made in this brief treatise which one would like to be illustrated by referring them back to the original writings of a few eminent mystics. As mystical experience is purely subjective and can only lead to confusion if expressed in words, no final judgment can be pronounced on its validity or otherwise by those who have no access to it. When mystics themselves adopt the sane agnostic attitude symbolised beautifully in that story of the Hindu saint who, on being questioned thrice on the essence of Reality, characterised silence as His essence, it befits us to follow their example.

S. VAHIDUDDIN,
V YEAR (PHILOSOPHY.)

time to devote to the contemplation of the ultimate values of life. Nawab Sir Amin Jung has now given us an opportunity to see for ourselves his brief treatise which was read before the Islamic Association. Glad as we are to know the trend of his thought, inseparable is the gulf that divides us. We should like to see the grounds on which Sufism and Vedantism are completely identified. While there are striking similarities between the two, and while Islamic Sufism might have been influenced by Vedantism they cannot by any stretch of imagination be treated as alike. Prof. Nicholson at least does not treat them as such. Secondly, the psychological basis of religious mysticism is not thoroughly appreciated, and no attempt is made to distinguish mystical experience from the pathological condition of the hysteric and the epileptic. Says the writer: 'I for one believe that Sufism is not inconsistent with science, because the good and evil resulting from the Sufi outlook is in accordance with the psychic discoveries of great psychologists like Freud and his disciples Jung and Adler.' Now such a statement confuses schools that fundamentally are at variance with one another. Jung and Adler are the former disciples of Freud who seceding from the Freudian school differ more or less radically from their master. To us, on the contrary, the trend of modern psychology is distinctly hostile to mysticism and religion. Prof. Leuba, a profound student of religious mysticism, takes by no means a favourable view of mystical phenomena. The distinguished Italian criminologist, the late Lombroso, approvingly cites a passage from Dostoievsky wherein one of his characters describes in a highly mystical vein the feeling of beatitude and harmony that he felt at the approach of his epileptic fits. As the modern psychiatrists approach the subject from the experience accumulated in the course of their vast researches in neurosis and other mental and sexual aberrations their point of view cannot be different. Though we do not see eye to eye with those extremists who find nothing of value in mystical experience save the unrestrained phantasies of sexual perverts or the insane we simply contend that the latest development of psychological thought is not favourable to mystical experience. But mysticism need not despair. All the great religions of to-day are now saturated

subjects as the following: Shaw and Shakespeare, Shaw and America, Shaw and the Actresses, Shaw and the Censor, Shaw's Women, Shaw's Socialism, Shaw's Religion, and Shaw's Future.

In the end there is a Postscript by Shaw, that makes the book a little more interesting. In his typical manner the hero of the biography retaliates upon the biographer, and in spite of paying full tribute to the merits of Harris, quotes an epigram of Oscar Wilde, to do himself justice: 'Frank Harris has been received in all great houses—*ONCE.*'

Considered from all angles, the only conclusion that one can reach, is the same as that of Shaw himself:

'In spite of the fame of his *Life of Oscar Wilde*, it is not really a biography. It is a series of impressions——'.

AZIZ AHMAD,
IV YEAR.

## Lucknow University Union Journal

*Annual Number 1932.*

The paper before us contains three sections—English, Hindi and Urdu, and puts before the world the achievements of the students of the Lucknow University. *The Convocation Address* by Prof. Radhakrishnan, *The Psychology of the Khaddar Movement* by Mr. Shaikh Ehtisham Ali (the President of the Union Society) and *O'Love* by Mr. K. S. Gupta are very good, while some of the pieces are 'poor indeed.' A brief sketch of the University in Hindi and the description of the Mushaira in Urdu are also good. But rare is that element characterised by the motto of the University as spiritual 'Light and Learning.'

B. N. CHOBE.

## The Philosophy of Fakirs

[*Notes of Talks on Vedantism* alias *Sufism before The Islamic Association, Theosophical Hall, by Nawab Sir Amin Jung Bahadur.*]

It is highly gratifying to note that even those whose life is chiefly devoted to the affairs of administration should find

# REVIEWS AND REVALUATIONS

## Bernard Shaw

By

FRANK HARRIS

ONE of the most remarkable contributions of the season to the literature of the year, is an interesting biography of Bernard Shaw by no less a person than Frank Harris. Frank Harris died immediately after finishing the last chapter, and as a very peculiar instance of the irony of life, the proof-sheets were left to be corrected by Bernard Shaw himself. Even Shaw had to admit: 'I have had to do many odd jobs in my time, but this one is quite the oddest.'

This is a portrait of Shaw the man, rather than a criticism of his works. The personality of Shaw the man, who cannot be separated from Shaw the Author, has been handled in a peculiar, yet typical Harrisian manner. Though Harris declares in the very beginning 'I know him to be a far better man than Wilde', yet there can be nothing as different as this biography, from his famous, sympathetic 'Life of Oscar Wilde.' Then he was a friend, the defender of a man who was condemned by society and law; here he plays the prejudiced rival, and takes no pains to hide his feelings. The book contains a few very curious outbursts of sentiment and sensitiveness, that can never be counted as merits in a biographer.

Frank Harris was a very close personal friend of Bernard Shaw, and he has said a few remarkable things about the man. But Shaw the Author deserves better treatment than he has received from him.

There are some very typical Harrisian epigrams, which might amuse the reader very much; such as:

'Our dear Shaw, a man of no principles, swears by many.'

In spite of his anti-Shaw spirit Harris has his 'fits of appreciation'. The various chapters deal with such journalist

| | |
|---|---|
| *Members* .... .... | 1. Rajeshwar Rao. |
| | 2. Ganpat Rao. |
| | 3. Venkat Ram Rao. |
| | 4. Govind Rao Pavar. |
| *Games Secretary* .... | Kishen Rao Manvihar. |
| *Secretary, Dramatic Assocn.* .... | Bindaprasad Srivastav. |

## Historical Society

| | | |
|---|---|---|
| *President* .... .... | Mirza Mahmood Ali Beg, B.A. | |
| *Vice-President* .... | M. Azam | iv. |
| *Secretary* .... .... | Sheshgir Rao | iv. |
| *Asst. Secretary* .... | Raziuddin | iv. |
| *Treasurer* .... ... | Daliluddin | iii. |
| *Editor, Khazina* .... | S. M. Ahsan | iv. |
| *Members* .... .... | 1. P. Kishen Rao. | |
| | 2. Bashir Husain. | |
| | 3. Govindprasad. | |
| | 4. Naziruddin. | |
| | 5. S. Muslim. | |

## Law Association

| | |
|---|---|
| *Vice-President* .... | S. Mahmood Ali (Final). |
| *Secretary* .... .... | Ismail Ahmed Meenai (Previous). |
| *Treasurer* .... .... | Iftikharuddin (Previous). |
| *Editor, Law Magazine* .... | Muslihuddin (Previous). |
| *Members* .... .... | 1. Bashir Ahmad (Final). |
| | 2. Anna Rao (Final). |
| | 3. Ramchandra Rao (Previous). |
| | 4. Venkab Rao (Previous). |
| | 5. Abul Khair Mazharul Haq Siddiqi (Previous). |

We have to congratulate Mr. Shanker Rao Jadhav on his praiseworthy success in the M.B.B.S., and Mr. Govinda Rao Deshpande on his selection for Tahsildarship. It is gratifying to note that Mr. Chandrakant Godsey, ex-President of our Sabha, has been selected in the H. C. S. and we take this occasion to congratulate him on his meritorious success.

In conclusion, we have much pleasure in recording our grateful and sincere thanks to our Superintendent, Prof. Shiva Mohan Lal, for the keen interest he evinced in the affairs of the Vidya Prakash Sabha.

P. KISHEN RAO,
*Secretary.*

# ELECTION RESULTS

## Union Society

*President* .... .... S. M. Murtuza, B.A.
*Secretary* .... .... B. Shamsunder, B.A.
*Librarian* .... .... Nazar Md. Khan.
*Asst. Treasurer* .... Abulkhair S. Ibrahim Husain
*Members* .... .... 1. Ghous Mohiuddin Razvi.
2. Muslihuddin.
3. Nazir Hasan Afandi.
4. Rashiduddin.
5. Ahsan Aziz.
6. S. Md. Ali.
7. Jamil Ahmad.
8. Azmatulla.

## Vidya Prakash Sabha Hindu Hostel

*President* .... .... P. V. R. Narsiah.
*Secretary* .... .... Keshav Rao.
*Asst. Secretary* .... Hiralal Kotecha.
*Librarian* .... .... P. Kishen Rao.

On the 16th of August 1931, we had a Hindi recital comprising *Ramcharit Manas*, the *Megh Duth* of Lakshman Singh and a few songs from Behari and Sūr.

Besides the local dailies we were taking *The Bombay Chronicle*, *The Modern Review* and *The Health*, the *Adabi Dunya* in Urdu and *The Bharati* in Telugu. We thank the Superintendent for lending us *the Kalyan* in Hindi and expect a further extension of his kindness towards the Library.

It may be remarked that under the auspices of our Sabha four extraordinary meetings were held during this year. On the 28th of Mehar 1340, Prof. Shiva Mohan Lal delivered a lecture on the *Importance of the Gita*. On the 10th of Dai 1341, Dr. Haridatt Sharma of S. D. College, Cawnpore, delivered a lecture in English on *The East and the West*. On the 11th of Dai Dr. Yusuf Husain Khan delivered a lecture on *Indian Nationalism*. On the 3rd of Mehar, P. Kishen Rao read a paper on *India and Federalism*.

Two meetings of the Association of Economics and Sociology were held in our Hall on the 12th of Mehar and the 3rd of Aban, the subjects respectively being— (1) Political Sovereignty is Necessary for the Economic Development of India, (2) The Purdah System is a Blot on Civilization.

On the 5th of November 1931 in a meeting held under the auspices of the Historical Society in our hall, Mr. Janaki Ram Pant read a paper on *Mussolini the Dictator*.

We had the good fortune to have Mr. Shanker Rao Jadhav, one of the best cricketers, as our Games Secretary, but unfortunately we lost the ground where we formerly used to play. Though our achievements in the field of sports were almost nil, our students got honours in literary activity.

P. Kishen Rao got the second prize in English elocution competition held on the College Day. Mr. V. Bheemiah secured a prize for Chemistry in Junior B.A. and Mr. K. V. Rama Rao obtained a prize in languages in the Junior Intermediate. Mr. P. G. Kulkarni, ex-Games Secretary, stood first in first division in LL. B. Previous.

# NEWS AND VIEWS

## Annual Report of the Vidya Prakash Sabha, Osmania University Hindu Hostel.

### 1340-1341 F.

UNDER the presidentship of the Warden of the Hindu Hostel, the election of the cabinet for the year 1340-1341, took place on the 17th of Shahrewār 1340. An attempt will be made in the following lines to show how far we succeeded in realizing the hopes entertained about us by the previous ministry.

On the 29th of Mehar the festival of Janama Ashtami was celebrated with usual splendour and we arranged a lecture on 'Lord Krishna's Life and Teachings' by Mr. Digambar Das Chowdhary. It is with immense regret that we learnt of the sad news of his sudden demise and we offer our sincerest prayers: 'May his departed soul rest in peace.'

The students of the Hostel staged the *Bhishma Pratiggya* in Hindi on the 19th of Aban at the Reddy Vidyalaya Hall. A medal was awarded to the best actor, Mr. Chandrakant Godsey, and a prize was given to Mr. Binda Prasad Srivastava, Secretary of the Dramatic Association, Hindu Hostel. He also secured a prize in the *Forced Marriage* presented on the College Day.

In the course of the *Dipavali Celebrations*, which fell on the 5th of Dai 1341, we enjoyed a gramophone entertainment.

*Holika* and *Ugadi* which fell, respectively, on the 19th of Ardibahist and the 2nd of Khurdad completed the year's festivals.

It may be noted that on the 25th of Aban 1340, we went on an excursion to Gandipett and Himayat Sagar. Later on some of our members went to the Nizam Sagar also.

Thirteen debates were held during the period under review; seven in Urdu, and six in English.

ಕಾಡು ಕುಸುಮದಂತೆನಕ್ಕು
ನಲಿದು ನೀನು ಸೊಗದಿಬಾಳು
ಮೇಲುಕೀಳು ಎಂಬುದೆಲ್ಲ ಅಳಿದುಹೋಗಲಿ
ನಾಡದೇವಿಗೆಂದು ದೇಹಮುಡುಪದಾಗಲಿ

(May you smile like a flower blooming in a forest—Forget all the differences—May your body be sacrificed to your Motherland.)

Noble sentiments nobly put!

Another poet describes Beauty as follows:

ಪ್ರೇಮಜೀವಿಗಳು ಪ್ರೇಮವನರಸುತ
ಪ್ರೇಮಿಸುವರಮೇಲ್ ಪ್ರೇಮವಸುರಿಸುತ
ತಮ್ಮ ಪ್ರೇಮವನೆಲೆನೋಡಿ
‘ಸೌಂದರ್ಯವೆ! ಎಂದರು ಹಾಡಿ.’

Two lovers met and loved each other and called their love ‘beauty’.

NARSING RAO,
IV YEAR,
*Osmania University.*

ಸಾವಿನನೋವಿಗೆ
ಕಲಮಲವೆದ್ದು
ನೆಲವನ್ನೆಲ್ಲಾ
ತುತ್ತುವೆನೆಂದು
ಗದರುತ್ತಿಹುದು
ಗರ್ಜಿಸುತಿಹುದು
ಬಡವರ ಬಗ್ಗರ
ತುತ್ತಿನ ಚೀಲದ
ಒಳಗಿನ ಒಳಗಿನ
ಒಳದನಿಯಾದು

From this we can conclude that Kannada poetry is taking a secular form. Humanisn is being introduced by the 'University wits' if I may call them such.

Prof. B.M. Sree Kanthiaya is the father of Kanarese blank verse. He translated some poems from Palgrave's *Golden Treasury* into Kannada in the form of blank verse. He wrote a drama called *Aswathaman* in imitation of Sophocles. It is the first tragedy in our literature. A reader does not think them translations but thinks them to be original. The genius of many young people who could not find any means upto this time burst out in blank verse. The magnitude of Kannada modern poetry is growing day by day. K. V. Puttapa, the Professor of Kannada in the University of Mysore, translated Shakespeare's *Tempest* into blank verse. It is a new creation in our literature. Upto this time no drama was written in poetry. He wrote *Yamansolu*, his masterpiece, in a fascinating style. An ordinary boy of VI Form can read the book and derive pleasure from it.

The great characteristics of the modern poetry are simplicity in style, pregnancy of meaning and secularity in subject. No modern poet teaches a religious doctrine or morality but he describes life as he finds it. So he is appreciated by one and all. We shall conclude with a few illustrations from modern poetry.

One poet celebrating the birthday of a girl blesses her thus :

Kannada literature declined during the 19th century although we find many minor poets writing in all the three methods that were represented by the three different sects of people.

We now enter the field of modern poetry. This is an age of renaissance in our literature. Before we deal with this modern poetry let us ascertain the circumstances which gave birth to the modern poetry.

This is an age of democracy. Democratic feeling has spread all over the world. East has been in close touch with West. Western thought, culture and civilization have crept into the East. The spiritual view of the East has been alloyed with the western material view. Kannada people are being educated at the Universities. There are the facilities to learn foreign languages. English has been made compulsory. So they are influenced by English literature. They are inspired, but it is quite impossible for them to put their fine ideas in old forms of poetry. There arises a conflict between old pundits, who advocate the cause of old poetry, and new-fangled people who are educated at the universities. They say that poetry is that which appeals to the heart. It needs no particular form. It is their opinion that rhyme and alliteration are not essential for poetry. So they improved upon Kanarese *ragali* in imitation of English blank verse. The old conception of poetry is undergoing a marked change. They do not care so much for religion now.

They have begun to write lyrics in a beautiful style. They advocate the cause of the poor. The spirit of independence is found in the modern poetry. One modern poet describing the wretched condition of the poor complains to God in these words.

'ದೇವರದೊಂದು
ಗೋರಿಯಕಟ್ಟಿ'
ಧರ್ಮದಧೂಪಕೆ
ಬೆಂಕೆಯನಿಕ್ಕೆ
ಗಣಗಣಬಾರಿಸಿ
ಪ್ರಾಣದ ಗಂಟೆಯ

and vachanas. Although the poetry of Virasivas did not entirely leave the aristocratic circle it was meant for the common folk. Every Kannada-knowing man can easily discriminate between Jain and Virasiva poetry. We shall give some specimens of both kinds.

A Jain invocation to God:

ಮ॥ ಸ್ರ॥ ಪರಮಶ್ರೀಸ್ನೇಹಗೇಹಾಯಿತ ಪದಕಮಲಂ ಚೇತನಾಚೇತನಾಂಗ।
ಸ್ಫುರಿತಾಘಾಘಚ್ಛಿದಂ ಭಾಸುರ ಸುರನರಸದ್ಭವ್ಯಸೇವ್ಯಂವಚೋವಿ॥
ಸ್ಫುರತ್ಸ್ಯಾತ್ವ್ಯಾಪ್ತ ಲೋಕತ್ರಿತಯನ ಪಗತಾಶೇಷದೋಷಾಳಿಮುಕ್ತಿ।
ಸ್ಥಿರಸೌಖ್ಯಾಂ ಭಸ್ಸ್ವಯಂಭೂರಮಣ ಜಲಧಿರಕ್ಷ್ಯಕ್ಕೆ ಶಾಂತೀಶನೆಮ್ಮಂ ॥ ೧ ॥
ಶಾಂತಿಪುರಾಣ.

A Virasiva poet invokes God as follows:

ಶ್ರೀಮದ್ಬ್ರಹ್ಮಾಚ್ಯುತೇಂದ್ರಾಸುರ ಗುರುಸುಮನೋ ಮೌಳಿವಿನ್ಯಸ್ತಪಾದಂ।
ಹೇಮಾಗಾಗಾರನೀಶಂ ಮುನಿಜನಹೃದಯಾಂಭೋಜವಾಸಂಭವಾನೀ॥
ವಾಮಾಂಗಾಲಾಗನಂ ಭೂಸುರನಿಧಿಮೆಚ್ಚಿದಂ ಭೂಮಿಯೊಳ್ ಚಂದ್ರಚೂಡಂ।
ಪ್ರೇಮಾಕ್ಕೈಮಿಕ್ಕು ಪಂಪಾಪುರಪತಿ ಬಸವಂಗೊಲ್ದು ಸಂತೋಷದಿಂದಂ ॥ ೧ ॥
ಬಸವದೇವರಾಜರ ಗಳೆಗಳು.

The style itself shows that Virasivas wrote in an easy style so that the common folk might understand their poetry and be benefited by it. Virasivas continued to write till the 17th century.

There arose a revolution in Kannada poetry in the 17th century. The religious tension reached its zenith. There was a great controversy between Lingayats and Vaishnavites. Each community strove to propagate its own principles. There was a group of Vaishnavites, who clothed their inspiration in a simple and easy style. They neither cared for prosody nor for grammar. Their songs are full of religious teaching. They wrote padas (ಪದಗಳು) and suladis (ಸುಳಾದಿಗಳು) instead of shatpadis and vrathas. They preached humanity, love, and non-violence. Although theirs was not poetry in the strictest sense there are many poetic touches in their songs. The songs have recently found place in our literature. Vaishnavites wrote till the end of the 18th century.

# THE DEVELOPMENT OF KANNADA POETRY

IT is necessary to know something about the Kannada language, and its antiquity before we embark on the real subject of the essay. Kannada is one of the most ancient languages of India. It is a purely Dravidian language although we find many Sanskrit words in it. 'Kanarese' literature is known to extend over a considerable period—the oldest specimen of Kanarese is, according to Prof. Hultzsch, contained in a Greek drama preserved in a papyrus of the second century A.D. So it is but natural that a literature which has covered 18 centuries should have many transformations. Civilization changes and tastes differ. So every great poet has to accommodate himself to the taste of his age, otherwise he will become unpopular and inglorious although he may make the age bear his impress. This was also the way of the Kannada poets of the early ages.

They did not write poetry for common people; it was meant for scholars and the aristocracy. All of them were Jains. Their poetry is religious and didactic. They dealt with religious subjects, because the people regarded their religion as all in all. The poet who did not aim at religion and morality was not considered a great poet and was not appreciated by the scholars and aristocratic people. They laid down rules of prosody and adhered to them strictly. They were great scholars so they could express their thoughts without any solecism. This was the condition of Kannada poetry from the 9th to the 12th century, although some Jains continued to write in the same style till the 15th century.

Lingayats or Virasivas came after the Jains. Their scholarship was not so great. They had to propagate their religion through their poems, so they adopted an easier method. They did not strictly follow the rules of grammar and prosody. They did not change the viewpoint of the Jains although they broke some rules. They preached morality and religion through poems

namely, service of special purposes in behaviour and limit by special problems in which the needs of insight arises'.[1] Schopenhauer *condemns* intellect and offers a way of escape for the metaphysical craving of man for the experience of union with the ultimate reality; the pragmatist *extols* intellect because the action which approves intelligence 'has an *intrinsic value* of its own in being instrumental'—it enriches human life, and the investigation of problems of the ultimate reality, as has been said, has, according to the Pragmatists, no significance or value for life.

MIR VALIUDDIN, M.A., Ph.D. (Lond.),

*Bar-at-law*,

*Department of Philosophy, Osmania University College.*

[1] Dewey's 'Some Implication of Anti-Intellectualism' in *Journal of Philosophy, Psychology and Scientific Method*, vol. vii, No. 18, pp. 477–481.

reject that intelligence which is naught but a distant eye, registering in a remote and alien medium the spectacle of nature and life.' They further deny the *value for life* of investigating the ultimate metaphysical problems and theories of philosophy in the past. They point out that since thought has been evolved in the human species simply to remove the biological wants and needs of the organism the 'attempt to discuss the antecedents, data forms and objective of thought apart from reference to particular position occupied and particular part played in the growth of experience, is to reach results which are not so much either true or false as they are *radically meaningless*'. Therefore from the standpoint of the pragmatistic theory of knowledge 'the taking of something whether that something be thinking activity, its empirical condition or objective goal, apart from the limits of a historic or a developing situation, is the essence of metaphysical procedure—in the sense of metaphysics which makes a gulf between it and science'. Thought arises in a psychological situation and its relevancy is entirely limited to it. The evolutionary doctrine treats every distinct organ or structure as an instrument of adaptation to a special situation so the pragmatists insist that the logical theory ought to be regarded as an account of thinking as a 'mode of adaptation to its own generating conditions',—these conditions being, as has been indicated above, the inner distractions produced by the complicated and jarring needs and desires of the organism.

To sum up: The pragmatists, taking Schopenhauer's premises that the intellect is evolved for the service of life and is inherently incapable of knowing the ultimate reality, seem to derive a different conclusion from what Schopenhauer himself meant to draw. What, according to Schopenhauer, is to be regarded as the *failure* of the intellect is from the point of view of the pragmatists exactly its *proper function*, for philosophy, according to them, can do nothing but to 'identify itself with questions which actually arise in the vicissitudes of life.' Philosophy does give insight into existence; it does render things more intelligible; but 'these considerations are subject to the final criterion of what it means to acquire insight and to make things intelligible, i.e.

In the pragmatic psychology we find the same two prominent features which we saw in the account which Schopenhauer gave of the nature and genesis of the intellectual activities—viz., the *purposive* character of thought and the importance of *conflict*. All thinking is purposive. Pragmatism recognises thoroughly that the 'purposive character of mental life generally must influence and pervade also our most remotely cognitive activities,' and it is guided by this principle in the construction of its theory of knowledge.[1] This viewpoint had been stated much earlier by Prof. James in his *Psychology*, *Briefer Course*, as follows: '. . . . mental life is primarily teleological, that is to say . . . . our various ways of feeling and thinking have grown to be what they are because of their utility in shaping our reactions on the outer world. . . Primarily, then, and fundamentally, the mental life is for the sake of action of a preservative sort.'[2] We have also seen how the presence of conflict is of equal importance. Our whole conscious life arises in conflict. Thought is born in struggle and in tension, in discords and discrepancies. It solves the problems, it overcomes the difficulties. The pragmatic theory of intelligence is thus a forward-looking theory. 'Intelligence as intelligence', says Prof. Dewey, 'is inherently forward-looking'.[3] Pragmatic intelligence is a 'creative intelligence' in the sense of moulding experience in view of the needs of life (i.e. 'in the service of the will') and determining the future qualities of experience. It is thus a process of *experimentation* and trial, and is, therefore, different from the creative work of the artist who is striving after an ideal.

Thus for Schopenhauer as well as the pragmatists the intellect is a biological instrument for improving human behaviour. But whereas Schopenhauer thus reducing the intellect to the level of a mere tool for action in the service of the will has recourse to 'instinctive feeling' or, a kind of 'intuition' to satisfy man's passion to experience the ultimate reality, the pragmatists elevate intelligence to the place of supreme instrument which enriches the whole of human life and 'deny and

[1] *Cf.* Schiller's *Humanism*, p. 8.
[2] *Psychology*, *Briefer Course*, p. 8.
[3] *Cf.* Dewey's *Essay in Creative Intelligence*.

of the intellect. He, therefore, assumes outright the existence of the organism with its vital needs and wants—its 'will-to-live', so to say,—and he assumes also the presence of environment with its natural energies. He does not try to rise (as Schopenhauer does) beyond the phenomenal experience which is for him merely an intercourse between the organism and the environment.[1] The fundamental questions, why organisms exist, why they strive and wish to live and propagate their species, which are in themselves exceedingly interesting problems, do not interest him as much as they did Schopenhauer who, as we have seen above, grounded these biological needs in the Will to Live, the ultimate reality which is an endless striving after life, and which individualises itself in animal organism. The pragmatist, then, taking for granted the organism and its needs, goes on to show how thought arises. He shows that the environment, in which the organism is placed, being not always friendly, the individual tries to mould it so that the needs of life and the desires corresponding to those needs may be realised. In such an enterprise, memory, imagination and thought arise as a help in the struggle for existence and being of priceless advantage are, according to the Darwinian laws, encouraged and preserved. It is thus the complicated needs of the organism that call forth thought and reflection. It would, in all probability, never have arisen and certainly would never have thriven 'if the affectional life of the *genus homo* had always been serene and blissful without alloy.' The entire business of thought is to remove the discordances and discrepancies that arise in the problems confronting us in our daily life. Logic is, thus, for the pragmatist, a group of changing and flexible rules which themselves arise and end in the needs and exigencies of life. It is *not* to be considered as 'a set of immutable and eternal laws to which any and every judgment must conform on pain of being condemned as false.' Thought is a process of experimenting with the materials of our experience, changing and moulding it for the satisfaction of our desires.

[1] *Cf.* Creative Intelligence, pp. 36, 37—Influence of Darwin and other Essays, pp. 155–157—Essays in Experimental Logic, pp. 228, 332, 425, etc.

## IV

This account of the genesis and nature of intelligence is, according to Schopenhaur, 'primarily zoological, anatomical, physiological.' How the unconscious 'Wille zum Leben' gives rise to intelligence is, indeed a problem. But the intellect, Schopenhauer maintains, has come into being in response to practical and biological needs of the organism and, therefore, it is designed merely for the practical purposes, that is to say, for 'the comprehension of those ends upon the attainment of which depends the individual life and its propagation'.[1] Two things stand out prominently in this account of the nature and function of the intellect; first the *purposive character* of the intellectual activities and second, *the importance of conflict.* The *raison d'etre* of thought is, as indicated above, to enable the individual organism to react successfully on the external impulses and influences and thus to conserve its being. From this point of view intellectual processes are *useful* in the highest degree. 'It is a tool of the most various utility'. And since the intellect is provided only in consequence of the practical needs of life its only function will be the satisfaction of those needs and in this way both our action and cognition will be controlled throughout by this purpose alone. The doctrine is thus thoroughly teleological, not indeed in the wider sense of a cosmic purposiveness but in the sphere of mental life only. Not less important is the motion of conflict. Consciousness, as has been fully emphasised arises out of *conflict.* It is the conflicting and intricate situation and also the complexity of the wants and needs of the organism that lead to the more and more perfect formation of the faculty of formulating ideas and its organs until, in the course of the struggle for existence, arose consciousness itself.

Now it is through this conception of the nature and genesis of the intellect, as we said above, that Schopenhauer paves the way for Pragmatism. The pragmatist is a biologist and an evolutionist. He looks upon mind and its products as biological instruments. He is interested to show how knowledge has arisen in the evolutionary movement and in pointing out the function

[1] Haldane and Kemp, vol. iii, p. 21.

vegetirte, sich entwunden hat. Dadurch wird hier die Bewegung auf Motive und wegen dieser die Erkenntnis nothwendig.'[1] It is obvious that as the animal rises higher and higher in the scale its wants and needs also become more and more complicated and it becomes more and more dependent upon opportunity and thus it stands in need of a greater degree of intelligence in order to survive in its struggle for existence. And when the objectification of Will reaches the stage of humanity we find that in the case of man—that 'complicated, many-sided imaginative being'—the needs and requirements of life become so bewildering and confusing that a perfect development of intelligence becomes the *conditio sine quá non* of his very existence.

Thus the development of intelligence keeps pace with the development of the needs of life. According to Schopenhauer, then knowledge is only a 'secondary added thing'; it is 'secondary and subordinate everywhere' and as he puts it, it was not necessary for the maintenance of things in general, but merely for the maintenance of individual animal beings. He emphasises the fact that the faculty of knowledge, like every other organ, has only arisen for the purpose of self-preservation and hence every animal possessess intelligence to find out the means of its own existence, thus to conserve its own being and to propagate the species. With man the case is not different. And if there is any difference at all it is just this; man has infinitely more wants than the animals and consequently his maintenance is much more difficult and therefore a much higher degree of intelligence is required in order to enable him to meet the demands of life. *The intellect, however*, springs *from the 'will to Live' and is nothing* but a *tool for its service.* It has been provided simply to meet the essential demands of life—nourishment and propagation. It is, in the words of Schopenhauer, 'a thoroughly practical tendency' ('durchaus praktischer Tendenz' iii, 333), which remains almost throughout entirely subjected to the needs of life. It is further designated by him as 'Notbehelf' and 'Krucke' which is simply meant to help the individual in its struggle for life.

[1] *Grisebach Ed.*, vol. i, p. 212.

the 'anatomical element' by Geoffroy de St. Hilaire) continues in all essential points unchanged in all the vertebrates, though they possess the greatest susceptibility to modification according to the varying environment. In the neck of the giraffe (for example) the same seven vertebræ which in the mole were contracted to such an extent as not to be recognisable are prodigiously prolonged enabling it to browse upon the tops of tall African trees. This unity of the plan, argues Schopenhauer, cannot be accounted for as one of the aspects of the adaptation of the organism to the environment. For this adaptation might have been in many cases as well or better realised by means of different structure and different numbers and disposition of bones in different species.[1]

Thus here we find a clear formulation of the evolutionary doctrine and Schopenhauer himself adds a reference to a passage in the *Parerga und Paralipomena* in which he expounds at much greater length his own particular form of organic evolutionism. This passage occurs in the small treatise (Chapter VI of *Parerga und Paralipomena*) entitled Zur Philosophie und Wissenschaft der Natur. With the publication of this work (1850) Schopenhauer 'unmistakably announced that the philosophy of nature to which his metaphysics of the will led was of a frankly and completely evolutionist type.' [2]

## III

As an evolutionist Schopenhauer also held that the function of the intellect has been evolved to meet the pressing demands of life just as the eyes and the stomach and the other organs have been developed and preserved through the agency of natural selection. Thus like every other character of complex living organism, thought has its history and its origin. It is the complexity of the wants of the situation or environment that demands a certain amount of intelligence. As Schopenhauer puts it: 'Die Hahrung muss daher aufgesucht, ausgewahlt werden, von dem Punkte an, wo das their dem Ei oder Mutterleibe in welchem es erkenntnisslos

[1] Cf. *Uber den Willen in der Natur*, 2nd Edition, 1854, p. 51.
[2] Cf. *Monist*, vol. xxi, p. 207, for a detailed account of the particular form of Organic Evolution which Schop. adopted.

unconscious principle which manifests itself in the temporal world. It is conceived as a 'blind urge' ('ein blinder Drang') towards activity and change, towards individuation, towards multiplication and 'diversification' of the modes of concrete existence and towards a struggle for survival between these modes', Schopenhauer designates it as 'Wille zum Leben' and he further characterises it as 'ein endloses Streben', as 'ein endloser Fluss', as 'ein ewiges Werden' without 'rest' and without 'purpose'. It objectifies itself in a gradual progression and cumulative order. Every objectification pre-supposes the preceding one but adds to it some new trait. Now this conception of the Will to Live readily lends itself to an evolutionistic construction and it is interesting to find that Schopenhauer himself, though in the beginning of his speculations he did not put such a construction, in his later writings did adopt such an interpretation quite explicitly and emphatically, and connected with his metaphysical principles a thorough-going scheme of cosmic and organic evolution. This has been fully brought out by Prof. Arthur O. Lovejoy in an essay entitled 'Schopenhauer as an Evolutionist'.[1]

And by the year 1850 Schopenhauer had *reformulated* his conception of the objectification of the will in thoroughly evolutionistic terms. It is strange to find that this fact has been ignored by most of the historians of philosophy, and Schopenhauer's position has been represented as consistently anti-evolutionistic.[2]

In his 'Wille in der Natur' in 1854 we find Schopenhauer setting down a brief and unequivocal affirmation of the origin of species from one another through descent. This alone, he thinks, would explain the unity of plan manifest in the skeletal structure of a great number of diverse species. In other words, Schopenhauer argues in 'favour of transformism by pointing to one of the most important and familiar evidences of the truth of the theory of descent, viz. the homologies in the inner structure of all the vertebrates'. The number and arrangement of the bones (called

[1] See *Monist*, vol. xxi, pp. 195–232.
[2] It is however noticed by Volkelt in his *A. Schopenhauer, Seine Personlichkeit etc.*, pp. 198–199 (Stuttgart, 1909).

# 'SCHOPENHAUER AS A FORERUNNER OF PRAGMATISM'.

(*A Paper read before the All-India Philosophical Congress held at Patna, December 1931.*)

'KNOWLEDGE generally rational as well as merely sensuous' says Schopenhauer 'proceeds from the "will", itself . . . . as a means of supporting the individual and the species, just like any organ of the body. Originally destined for the service of the will, for the accomplishment of its aim, it remains almost throughout entirely subjected to its service: It is so in all brutes and in almost all men.' [1] It is through this conception of the nature and origin of thought as subordinate to the needs of life that Schopenhauer seems to prepare the way for Pragmatism, according to which our thought, however subtle, delicate and elaborate in the last instance, aims only at purely practical effects. In the above mentioned passage, as Prof. W. P. Montague [2] points out if we substitute for 'Will', the 'concrete organisms' whose needs and wants are in conflict with one another and with their environment we could take it as a tolerable formulation of the theory of genetic psychology which is lucidly set forth by Prof. John Dewey and also in the writings of the Chicago School. It is on this changed conception of the nature of thought that Pragmatism also bases its changed account of 'Truth'. And these two problems constitute the very essence of the pragmatic theory of knowledge. I shall proceed to consider here Schopenhauer's view of the nature of intelligence and its function in order to determine in what sense he may be regarded as founder and the best interpreter of the pragmatist conception of intelligence.

## II

According to Schopenhauer the 'Will' is the absolute and ultimate reality. It is neither mind nor matter but a blind and

[1] *The World as Will and Idea*, Tr. by Haldane and Kemp, vol. i, p. 199.
[2] *The Ways of Knowing or The Methods of Philosophy*, pp. 154–155.

# VERSES

## Song of the Twilight

I SAW Twilight set her golden feet
On silvery water
And look upon the wooing earth
With beaming eyes in her blushing face,
The rising moon and the sinking sun.
Her drifting feet danced in rapt silence
And she sang her life-song of a thousand colours.
It faded on her petalled lips
As one eye grew dim and was gone ;
But the other rose high and began her milky song.

## On the First Day of the Rains

HEARKEN, the harp's music the wind's fingers play
On the twinkling strings of the rain,
And the life-song pours into the heart of everything.
Behold, the children, who run to catch
The rushing water in tiny pools, appear
Like golden angels in the earth's dim dream ;
And the eastern sky like a lovely maiden
Lifting up her head after a bath
And shyly hiding her face in the clouds, wearing
The jewels of the rainbow round her neck.

SHER MOHAMMED KHAN.

*

# THE WORST DAY OF MY LIFE

I WAS not more than seven years old when on a certain day (the day which is the worst day of my life), I asked my mother about every member of my family. She told me about some of them, that they were my relatives, and advised me to respect them. My little brain was not able to understand the meaning of 'relatives'. I was about to ask the meaning when my playfellow (the child of my nurse), came to play with me. I at once remembered that my mother never included his name with the names of those whom she called relatives. Now I remembered that my mother excluded many other persons and never told me anything about them. I asked her: 'Mamma, why didn't you include the name of our old gardener, my loving nurse, my dear playfellow, etc.?' She laughed and said, 'You baby, they are our servants, how could I put their names with those of our family who are the masters?'

My poor little mind, my simple and true mind, my heavenly brain, never understood the meaning of my mother's three different words 'Relatives', 'Servant' and 'Master' for the same kind of creatures. I wish I had not asked the question. I wish my mother had not tried to understand me. I have some heavenly memory of those days when my mother had not told me, had not tried to make it clear to me. That was the 'worst day' of my life, because after the very worst day I was no more in that world where there were no servants, no masters, no relatives. Now I was in a world which is filled with servants and masters.

HASAN ASGHAR
V YEAR (HISTORY)
*Osmania Univ. College.*

trifle like that is unreasonable. Irritability and querulousness of this kind shows a temper wholly out of keeping with our easy-going and happy-go-lucky ways. 'Live and let live', is our motto, and visitors should try to fall in with our ways, if they wish to come here and be happy and welcome among us.

I am, Sir,
Yours faithfully,
A. VICARABADI.

solitary, somnolent porter, peacefully sucking his mango, is not cruel enough to shoo them away. Let others carp and cavil, but we Vicarabadis feel that at last things are as they should be.

I hope I have been successful in giving the impression that, being far from the hurly-burly of life, we are quiet and peaceful people. So it is absurd of those who come here for a few days to expect us to hustle. Visitors are sometimes very exacting. Some months ago, I believe, a visitor complained of, what he called, the leisurely and dilatory methods of our local post-office. The post-master is supposed to open the post-office at ten in the morning but, having some important work to do at home, such as having a hair-cut, or making arrangements for the naming-ceremony of his latest baby, he arrives sometimes at twelve and sometimes at two in the afternoon. Well, after all, why shouldn't he? He feels, and rightly, that people come here for rest and quiet. So why should they be so frantically regular in their correspondence? And if they miss one post, surely their letters could go by the next. And why should they be always pestering him to sell them stamps? Surely, if he is late in coming to the post-office,—only an hour or two, and never more than two or three times a week,—they could post their letters without stamping them. The postal department is obliging enough to carry letters without their being stamped. So why make a fuss? Another ridiculous complaint is that you cannot register letters going by the British post or send money orders from the local post-office, and that you have to go to Tandur for the purpose. If people were only reasonable, they would see what an advantage this really is. They could enjoy a pleasant ride in the train to Tandur as well as register their letters or send their money orders. Just for a trifle like that, we feel that it is unreasonable to complain and be cantankerous. We feel that visitors here often make mountains out of mole-hills: for instance, a few days ago, a visitor returning to Hyderabad by the evening train had a great deal of luggage which had to be weighed, and the clerk in charge of the weighing machine couldn't be found, as he had gone out to have his tea. Well, if the train *will* go at five, when it is time for tea, what is a poor, hard-worked fellow to do? The train can always wait a little: the boiling water in the engine doesn't easily get cold but tea does. To lose one's temper over a

are not unmindful of the glory that was Bidar, but people seem to forget the grandeur that was Vicarabad.

As I have just spoken of the railway, I should like to mention the welcome change that has come over things recently. In the old days, the railway officials were very officious. Even for important district officers, if they were late in getting to the station, the train would not stop for more than ten or fifteen minutes. And if you were having a meal in the refreshment room, you couldn't dawdle over a second helping of a dish. The guard and the station master were always at your elbow to see that you bolted your food within the scheduled time. But the railway officials, one is glad to say, are altogether more human now, and have some consideration for the human weakness of unpunctuality. You can now have your third helping of a favourite dish—if such a thing is ever cooked at any railway refreshment room—or munch your cheese and biscuits in peace and at your leisure, without having the glowering eye of an irate railway official staring disapproval at you. We are sometimes apt to forget that machinery is there to serve man and cater for his comfort, and if time and tide do not wait for man, a train at least should. Far too much importance, I feel, is attached in these mad, modern days to schedules and time-tables and regularity and all such tedious things that make life a dull, mechanical routine and rob it of its spontaneity. We Vicarabadis, at least are not soulless people of dull routine and mechanical punctuality. We realise the profound truth of Oscar Wilde's saying that 'punctuality is the thief of time'. But since the railway has fortunately changed hands, there is a distinct and welcome change for the better. Gone is all that quite unnecessary, un-Indian bustle and hurry, and a welcome quiet and gentle peace have descended upon the railway station here. There is no jostling now on the platform, no raucous voices of the porters are heard any more, even the strident voice of the all-important station master is lowered to a gentler key, a more human speech. Goats and donkeys wander about at their sweet will—as all free animals should—over the rails and on the platform, even within a few minutes of a train's arrival, but the

the shackles of the purdah. In the early morning and in the cool of the evening, the fields are a blaze of colour with the polychromatic *saris* of the ladies who take the air twice a day. Except for their multicoloured *saris*, the only colour in the fields just now is the red of the soil and, here and there, the fierce scarlet gesture of the gold mohur.

We are, as a community, highly educated too. Instances are not wanting of men, and even women, of this place who have passed the Middle School Examination: and lest you should think that they are romancing about their academic successes, they show you, with pardonable pride, their certificates which are framed and hung up in their drawing-rooms.

We have attractions for all kinds of visitors. For those who are fond of walking, there are large open spaces, where they can walk to their heart's content. For the exercise-fiend, there are ploughed fields with up-turned clods, which will give him as much exercise as he wishes for. For those who wish to loiter along in a leisurely way, combining meditation with gentle exercise, there are shady lanes where they can saunter along undisturbed. For the romantically minded, we have 'Lovers' Lane', a cool, shady lane with two or three rose-embowered cottages *à deux*, ideal habitations for a honeymoon couple. By common tacit consent no one walks through this lane, for fear of prying upon the privacy and disturbing the billing and cooing of these happy turtle-doves.

Vicarabad is one of those haunts of peace and *dolce far niente* that are so welcome in these days of hustle and hurry, where, 'far from the madding crowd', you forget the ignoble strife and struggle of the world. I would not have it understood, however, that we are lotus-eaters exactly; oh no, we are no shirkers of work, we do our two or three hours of work a day as regularly as anyone else.

Vicarabad is now an important railway junction; visitors to Bidar have to change here. But we rather resent the attitude of people who exalt Bidar at our expense: they seem to use us as a stepping-stone to higher things. We are cultured people, we

They say the Lion and the Lizard keep
The Courts where Jamshyd gloried and drank deep.

Old Omar must have written his lines on just such another sad ruin as this.

Wild life of the jungle too is not lacking on this spacious hill. Nilgai and Sambur can be seen wandering about freely and fearlessly, for shooting is discouraged here now. There is, indeed, a local legend that a very old tiger haunts this hill, but, as no one has seen him within living memory, perhaps it is only his ghost that wanders about, and as even his voice, which some profess to have heard, is said to be thin and squeaky, perhaps it is only the ghost of its ancient roar that is faintly heard now and again.

The air of Vicarabad is very salubrious and cool; the temperature here is at least half to one degree cooler than that of Hyderabad; it has never been known to go beyond 114 degrees in the shade; no wonder Vicarabad attracts visitors in the hot weather. The water of this place is said to contain a little iron; that is perhaps why it is slightly rusty to the taste. But it is a tonic in itself and a natural *aperitif*; what though it is not entirely odourless; what though it is also not entirely colourless, as, I believe, all good water should be. It is slightly pinkish in shade: the local poet, to whom I have referred, called it once, as local tradition says, 'roseate as the feet of Aurora and redolent as the locks of Hyacinthus'. But that, perhaps, is a slight and excusable poetic exaggeration. Before condemning it, however, we must remember that even in large cities water sometimes, for the sake of health, has to be coloured with potassium permanganate, and is sometimes, for the same reason, slightly scented and flavoured with chlorine. So that Nature here has saved man a great deal of trouble.

Although rural, we are a very advanced and progressive community. Even the modern purdah-breaker, who tilts not at windmills but at the veil, will find that we are not obscurantists. The local ladies of the highest social status walk about freely here, having discarded the trammels of convention and broken

on it in his Collected Poems, and will remember the fine opening lines of the poem :—

O Anantgiri, height sublime,
Far-famed in every distant clime.

From the top of this high hill, you have a wonderful view of the country below and around you. Goldsmith's 'Traveller', on the testimony of Macaulay,—and his statement must be true, for was not Macaulay a reliable historian?—was able, from his high perch in the Alps, to look down on three countries, but a visitor from the top of Anantgiri can look down on no less than five—or is it only four?—different districts of H. E. H. the Nizam's Dominions. A truly wonderful panorama stretches out before you, as far as eye can see. Sitting on this high hill, away from the bustle and murmur of human life, one realises a little the aloofness and unconcern of the gods on high Olympus when looking down on humanity and its little concerns from their sublime height.

On a small, flat stretch of ground on the top of this hill are the ruins of what once must have been a fine shooting-box, which was built by the Prime Minister I have alluded to, but all that remains now is a few rusty and decrepit walls of corrugated iron. It must have been a luxurious pavilion in its heyday, comfortable and cool, for, to keep the heat out, the corrugated iron sheets were lined with thick felt, which now alas! hangs in tatters. One can imagine the whiskered and bearded men of the 70's and 80's carousing deep and making merry in this shooting-box in the evenings after the day's sport was over. They were a race apart, those men: life ran an even tenor for them, they did not bother about the morrow: they were care-free and happy, playing pranks and laughing at their ribald jokes. Life had a savour of its own for them which we, in our age of hurry and bustle and noise, have entirely lost. They are dead and gone now, those fine, genial, Falstaffian figures of the 70's, whose photographs, in faded daguerreotype, may still be seen preserved in some family album so dear to Victorian times. The shooting-box, where they held their Bacchanalian revels, is all in rack and ruin now, serving as another pathetic reminder to humanity of its little day.

were foxed and yellow with age, but he had had most of them sumptuously bound in morocco or in calf. Of course, I am very fond of first editions and greatly admired his collection, but once when I suggested rather timidly that perhaps the first edition of a law book might be slightly out of date, he was extremely indignant, and said with great dignity that the edition that was good enough for Lord Reading, who rose to be Chief Justice of England, was good enough for him. Thinking over this argument, one had to admit that perhaps he was right.

The other distinguished man was our doctor. Subsequent to his retirement from government service, as sub-assistant surgeon, he had acquired a great deal of experience and skill in medicine. In his old age he had settled down in his native place, and gave the benefit of his knowledge—free in most cases—to his fellow-townsmen. But some people are never satisfied. They used to say of him—rather uncharitably, I think—that he was inclined too much to favour the undertakers. What can the most skilful physician do when people *will* come to him in their last moments? Besides, people *have* to die some time or other. But it's an ill wind that blows nobody any good: the doctor got his fees, the undertakers received their wages and the patient was relieved of his pain. So perhaps all's well that ends well.

I wonder what the poet and the lawyer and the doctor would have said, could they have seen these post-mortem eulogies. They were all of them modest, self-effacing men of a retiring disposition who hated to be praised openly or have their good qualities made public. So if I had written these panegyrics in their lifetime, in just indignation the poet might have lampooned me, the lawyer might have sued me and the doctor, with one of his green pills or purple tinctures, would have sent me—to what place I wonder! The one I cannot hope for, the other I dare not think about!

One of the show-places of the neighbourhood is our local hill-station, Anantgiri, which is no less than twenty to twenty-five feet higher than the sea-level of the locality. This hill has been described by many people. The great local poet has paid his tribute to it: your cultured readers will, no doubt, have read the noble ode

and this, I am sure, will be accorded to us through the medium of your popular and widely read magazine.

Way back, as the Americans would say, in the 70's, Vicarabad was discovered, one might almost say founded, by one of the famous Prime Ministers of Hyderabad, after whom it was then named. This does not mean that we are parvenus in any sense, or that this place has grown up in a night like a mushroom. Indeed, we go back to times immemorial, but here I am not concerned with historical disquisitions or topographical researches. Those who are interested in such things may refer to gazetteers and such other tedious works of reference. All that I wish to touch upon are the beauties and the attractions of this place.

One of the places of attraction here is the house of our famous local poet who, alas! is with us no more. Indeed, it is a place of pilgrimage to visitors from far and near. His fame has extended to Tandur and Wadi, and pilgrims from even far-distant Gulburga have been known to visit the house, walking, with hushed reverence, about the large halls, gaping in silent awe at his wondrous *bibelots* and his bric-a-brac from Birmingham, or asking in whispers details of the poet's ascetic life, and looking at the sacred desk where he composed his masterpieces or fingering gingerly the delicate jade pen with which he wrote them. The caretaker of the house, who shows the pilgrims round—for a consideration, of course,—is a character himself. He would have won fame as a writer of fiction: he has a marvellous memory and a remarkable power of invention; he remembers the titles of all the poems that the poet has written, and, where he doesn't, he invents them with marvellous plausibility. He can also show you the room or the odd nooks and corners of the garden where each poem was composed.

Mention of the poet reminds me of two other local men of distinction, who also are gathered to their fathers. One was a lawyer who, finding Bidar too small for his great abilities, had migrated to Vicarabad, where he had established a large practice. He used to boast of the distinction that he was one of the only two Hyderabadis who were called to the Bar in Dublin. He had a large collection of law books, mostly first editions. Their pages

# OUR VICARABAD LETTER

VICARABAD,
*June, 1932.*

To

THE EDITOR, *Osmania University College Magazine*,

Dear Sir,

HAVING heard of your esteemed journal—for your popularity has reached us even in distant Vicarabad—I venture to write and tell you something of Vicarabad, so that through you it may reach a wide public. If your circulation is as large as that of your two famous contemporaries, *The Hyderabad Bulletin* and *The Saheefa*—and I am given to understand that it is—then I am sure of a public both in H. E. H. the Nizam's State and outside it.

In these modern days of publicity, I feel that it is not right for us to hide our light under a bushel. Many of the interesting towns of Europe are written about and described, with the result that they attract large numbers of visitors and so become not only famous but prosperous. That is what I feel Vicarabad needs: it needs to be written up: but not in the cold guide-book manner of a Murray or a Baedeker; it requires the friendly pen and the intimate touch of an E. V. Lucas. But possessing neither the advertising style of the guide-book nor the inimitable manner of a Lucas, I must try to do the best that I can.

I fear we have been too modest in the past, too apt to say to ourselves that good wine needs no bush, but you will agree with me that even the best vintage needs to be advertised in this commercial age. I feel sure that after reading this, your public will see that Vicarabad is a place well worth a visit. By this I do not mean to suggest that we are entirely neglected: of course, we have our share of annual visitors—'fit though few'—but we feel that by our modesty in keeping silent about ourselves, we are depriving a large number of people of the beauties and the benefits of this place. So that, as I said before, we need a little publicity,

# THE CLOUDS ROLL BY

We know not where we go,
We know not how we came,
In blue, blue deep we row
We watch the planets' game.
We sail to isles of dreams
To seek enchanted cells.
We float, we sigh, we swim,
Where lovely Luna dwells.
We give the Moon a silver veil,
A shroud we give the Sun,
We give to Earth a thunderbolt,
But lo !—the course is run.
We see the wreck is nigh,
How shallow is the Deep.
We laugh and linger in scorn,
We know we have to weep.

AZIZ AHMAD,
IV YEAR,
*Osmania University College.*

falling into the water. He ran to the well and cried 'Kamala'. 'Ramacharan', cried a female voice from inside. Instantly he jumped into the well and the next morning both were found in each other's arms. Kamala, like Ramacharan, started from her home to put an end to her life and seeing some one coming threw herself into the well and thus sacrificed her life. In vain did their parents weep for them. A *Sadhu* who was passing by the well and heard the whole story only said: 'They are married in Heaven', muttering, as he passed on: '*Shanti*'.

R. MAHADEV.

## A QUERY

He laid his hand upon his heart
And said: 'How sad that we must part!'
I wonder what he would have said
If he had laid it on his head.

J. O. KER.

them. It was a pleasure to them to communicate to each other the extent of their love and more than once had they quarelled over the question whether a man is more faithful in his love or a woman.

Such was the state of affairs when at the end of the college term Ramacharan received a letter from his mother asking him to go to Yallamanchili in the ensuing holidays. He took leave of Kamala, promised her that he would be writing a letter once a week and would come at the end of the holidays, as he had to complete one more year for his Intermediate. After his return home Ramacharan kept his promise and only the other day he had received a letter from Kamala informing him of her success in the Matriculation in the first class, which she added she would not have obtained had he not helped her as he did. He was thinking of going to Madras in a few days when he received two letters, one from the Superintendent and one from Kamala herself. The former was an invitation asking him to attend the wedding of Kamala, and Kamala wrote to him what had happened since his return home; how her father refused to allow her marriage with Ramacharan; how he abused her regard for a poor villager; how he insisted on her marrying a boy from a rich family who had failed thrice in his Matriculation and lastly how she had decided to sacrifice her life rather than to marry him. This was the cause of his meditation.

Ramacharan returned to Madras but there he was not received by the Superintendent with the same regard as he was hitherto. He could not even after many trials obtain a chance of speaking to Kamala. All that be could observe was that preparations for marriage were going on rapidly and all that he could hear was that Kamala was going to be married to a rich man of Madras. It was the 10th of April and the marriage was to come off on the 11th. Ramacharan, failing in his attempts to obtain even a glimpse of Kamala, decided to put an end to his life on the same day. Behind the Hostel and not far away there was an old well. He started towards it. It was ten o'clock in the night and the moon was shining brightly. When he was some twenty yards from the well he saw a figure approaching the well from the other side. One minute passed and he heard a great noise of some heavy body

# MARRIED IN HEAVEN

'MY boy! Why do not you take your meals? It is twelve o'clock now and you have not even had breakfast to-day', said a woman of forty-five to her son. Ramacharan rose from his chair where he was writing something idly and followed his mother to the kitchen. He took his meal but all that he did to conceal his thoughts was not sufficient to keep his mother from guessing what passed in his mind. She asked him again and again what he was brooding over but all that she could obtain in reply was that he had not answered his papers quite satisfactorily. This answer did not quite satisfy her either, but it was enough to suppress her curiosity for the moment.

Yallamanchili was a village in the Vizag. District and Ramacharan was a student living in that village. His father had died when he was very young, leaving some property. His mother since the death of her husband spent the whole of her time on her only son. Ramacharan, too, was a very clever boy. He passed his examinations with distinction and stood first in the Lower Secondary, and Matriculation Examinations, obtaining first class honours and carried away all the prizes awarded in that connection. Such a promising boy should not be kept idle, so his mother sent him to Madras to prosecute his studies there in college. Ramacharan, a boy of eighteen, was thus obliged to leave his native place for the first time.

He met many things in Madras which attracted his notice but that which attracted him most was Kamala, the daughter of the Superintendent of the Hostel he was living in. She was a girl of fifteen studying in the Matriculation and was the pride of her school. She used to come to Ramacharan to ask him to solve her difficulties and these occasional interviews had the effect of deepening the impressions of their first meeting. They used to go for a walk every morning and evening exchanging their ideas about things which interested them both. As time rolled on that company which was at first a pleasure, became a passion to both of

deprivation for six months. In ancient times this disease was common among sailors and others who used to sail for long periods without having citrus fruits and green vegetables in their diets. Deficiency of this vitamin for a long time especially affects the cardio-vascular system and lymphoid tissue. Thus scurvy causes hæmorrhage (especially of the gums), loosening of the teeth and accumulation of blood underneath the skin. Prolonged scurvy in the absence of Vitamin C is fatal.

There is great expectation and probability of finding out a sixth vitamin. There is a possibility of its remaining with Vitamin B, and consequently it will be a water-soluble vitamin. Its special concentrated sources and ordinary sources will coincide with the sources of Vitamin B. The lack of this vitamin will have very serious results. Pellagra, a fatal disease, is said to be caused by the lack of this vitamin.

S. N. VARMA,
M.B., B.S. (II YEAR),
*Osmania Medical College.*

set is advantageous to health. This vitamin is absent in polished rice, white bread, and vegetable oils.

*The Fat Soluble Vitamin E.*—The Vitamin E is obtainable from the vegetable kingdom, especially from an oil extracted from sprouting wheat germ. This vitamin is necessary for reproductive organs and the growth of an animal. The experiments on rats prove that the absence of this vitamin causes sterility.

*The Water Soluble Vitamin B.*—The other name given to this vitamin is antineuritic, because this vitamin guards the body against polineuritis. This vitamin is especially found in concentrated form in yeast. The ordinary sources are green vegetables, wheat germinated, wholemeal bread, unpolished rice, milk, egg-yolk, oats, whole grains, maize whole grain, barley whole grain, peas dry and germinated, nuts, onions etc. It is not present in polished rice, white flour, vegetable oils and sago etc. The deprivation of this vitamin causes polineuritis, for experiments on animals show that polineuritis is produced most rapidly in pigeons within a month. The experiments on rats show that growth is arrested in young rats in three days. Beri-beri is common in Bengal, China, Japan and among those people who generally eat polished rice and white bread. If the aqueous extract of the outer portion of rice is added to the diet, the disease is cured and resistance is produced in the body against this disease. The Japanese, as we know them, are practical people. As soon as they introduced these preventive measures the disease became a thing of the past in Japan. Polineuritis causes severe nervous symptoms, digestive troubles, paralysis, swelling of the limbs and trunk, with accumulation of fluid in those parts. This disease is fatal. Antineuritic vitamin is slightly affected by heat and oxidation.

*The Water Soluble Vitamin C.*—It is designated as antiscorbutive for the reason that it cures and protects against scurvy. The chief sources are the juices of citrus fruits such as lemons, oranges etc. It is mostly found in tomatoes, onion, garlic, cabbage and other green vegetables. It is absent in rice, white flour, wholemeal bread, in all the vegetable and animal fats except milk. The absence of Vitamin C produces scurvy after

an ophthalmic or eye disease called Xerophthalmia. The concentrated source of this vitamin is cod-liver oil. Ordinarily it is found in animal fats, milk, butter, cream, egg-yolk, wheat bread, unpolished rice and germinated grains. This vitamin is not present in polished rice, wheat white flour, and vegetable oils. This vitamin is destroyed on heating, e.g. milk boiled with ordinary process loses its Vitamin A. The destruction of Vitamin A depends upon the process of oxidation. If the milk is sterilised in an autoclave or heated in an oxygen-free utensil, it will not lose its vitamins. The deprivation of this vitamin in the diet leads to the arrest of growth in young animals and children and is often fatal to them. In adults it causes Xerophthalmia, night blindness and lowered resistance to various lung, skin and other affections.

*The Fat Soluble Vitamin D.*—The Vitamin D is named antirachitic because it protects the body against a bone-deforming disease called rickets. It is found with Vitamin A. It is present in very large quantities in cod-liver oil and butter. It is more resistant to heat and oxidation than Vitamin A. The present experiments prove that it is particularly related to sunlight. This close relation and production of this vitamin from Ultra-Violet rays is proved by the fact that if Vitamin D is destroyed from milk and this milk is given to a child for a long time, the child will suffer from rickets and if Ultra-Violet rays are passed into such milk and then used it cures rickets. The absorption of calcium salts in the intestine depends upon this vitamin; the absence of which particularly affects cartilages, causing rickets and deficient dentition. Rickets especially occurs in cold countries, in people in whose houses there is no entrance of sunlight and in children fed only on artificial foods. Of two groups of research scholars one of them held the opinion that this disease was purely related to sunlight and was caused in its absence. The other urged that only deficient food was its cause. Both views are right, because there is a relation between sunlight and food: the Vitamin D in the food directly comes from Ultra-Violet rays of the sunlight. The sunlight causes the production of Vitamin D in the skin. A sun-bath just after sunrise or just before sun-

# VITAMINS

THE most careful experiments and keen observations show that if an animal is fed on pure proteins, carbohydrates, and fats with the addition of necessary salts and water, it soon becomes ill, loses its weight and finally dies, although the quantity administered is physiologically correct. Under these circumstances, if the animal under experiment is young, the growth is arrested. A very small quantity of natural food remedies this evil. The history of long voyages and of navigation was the history of struggle against scurvy, and a little quantity of lime juice or orange juice added to the diet, cured and protected against the disease. Polineuritis was very common in rice eating countries especially when they were eating polished rice. The disease disappeared when the outer portion of the rice was restored to their diet. The polished rice feeding in fowls produces polineuritis and this disease vanishes after the use of unpolished rice. If one set of rats is fed on only fresh milk aad the other set on milk proteins, milk carbohydrates, milk fat with considerable amount of salts and water in physiological proportions ; the former set of rats grows normally and the latter group loses its weight, falls ill and at last death results. These experiments prove that there is something extra in lime juice, in the outer portion of rice and in fresh milk which is essential for the growth and protection of health. These accessory food factors are termed *Vitamins*. The chemical composition of these extra materials is not yet known, but their presence in the food is discovered by the diseases caused by their absence in the diet. These extra food substances are arranged chiefly in two groups—(1) Those which are soluble in fats; and (2) those which are soluble in water. The former group consists of three vitamins which are named A, D and E ; the latter are classified into two vitamins B and C.

*Fat Soluble Vitamin A.*—The vitamin A is spoken of as antiophthalmic since it has curative and protective value against

itself to students of natural history and, in fact, all lovers of natural history. Let me first bring one fact to your recollection. You might have heard of men who are used to get up from their sleep exactly on the stroke of four or five. It is indeed a habit, and the processes involved are psycho-physiological. The chief operator is really the sub-conscious mind. Might it not be that animals possess certain instincts which in the accuracy of their operations equal in degree though not in extent—or correspond to—the operations of the sub-conscious mind. When we are urged by the sub-conscious mind we do things in spite of ourselves. No reasoning is done. Even so animals might do certain things in spite of themselves moved by some sort of a sub-conscious mind of their own. We may give it the name of developed instinct or any other name we choose but for an explanation of its operation we must look to the processes attributable to a mind however undeveloped it may be—and in this case 'mind' may be defined as a consciousness developed by the vibrations and activities of the brain.

The subject is an interesting and fascinating one and opens up a wide field for study and observation to such as may be interested in it. Valuable results obtained may teach us something of ourselves, too.

A. R. CHIDA.

say, not ten minutes either too early or too late. If he is too early he may be ' winded ', and, of course, if he is too late he misses his supper.

Coming nearer home we find much to exercise our thought in the strange doings of the domestic cock. From time immemorial the crowing of the cock, ' the instinctive herald of the dawn ' as Harindranath puts it, has been taken to be the first signal of the approach of dawn, and in many parts of the world millions are still guided by it and, in our own country, it is the morning cock for the villager who checks its accuracy by an astronomical observation—by noting the brilliancy and position of the Morning Star. The cock usually crows between four and four-thirty in the morning and though many centuries have passed since man has been noting this peculiar ' faculty ' possessed by the cock, no one has been able to supply an explanation.

All domesticated animals, whether a cat, or a dog, or a horse, or an elephant or even a rabbit, have the faculty to develop the time-instinct if only they are fed or watered at a particular hour every day for a fortnight or a month. I have known of a cat and a dog, which used to be fed under a tree exactly on the stroke of twelve every day, present themselves at their post precisely at that hour, correct to the very minute. I have also known dogs, and even cats, go out to meet their masters (or mistresses as the case may have been) at precise hours, knowing the hour of their coming home from their work. How did these animals regulate themselves ?

Reference to habit alone will not furnish an explanation to this phenomenon. In fact, it will be a very feeble solution, because even man, who is supposed to be the lord of creation, cannot develop any habit producing such an accurate result. The argument might be advanced that animals are so sensitive to changes in the weather that they can guess when it is nearing midnight, or past midnight, or approaching dawn. Very possibly so, allowing the fact that animals have some idea of their own (and they surely must have) of midday, dawn, evening and midnight.

The best explanation I can think of is one that may commend

# THE TIME-INSTINCT AMONG ANIMALS

IT is not often that we pause to think over the marvels which abundantly manifest themselves in the animal world. Not even the lover of natural history spares much of his time for an intense study of what I may describe as animal psychology. This is a matter for very great regret, for the reason that by want of enterprise we place a limit to the extent of our knowledge of the ways and workings of a section of creation of which man himself is a part though he is the undisputed master and lord of it.[1]

Let us, in this short article, consider but one part of animal psychology—the time-instinct which is so strongly marked among certain animals. It may be safely asserted that almost all animals possess the time-instinct—that is to say, they possess sometimes a definite, but invariably a vague but workable idea of the passage of time. Whence comes this idea, this perception, or impression, or whatever we choose to call it? Until the study of the problem of animal psychology goes further than it has, we cannot attempt any satisfactory answer even in the nature of a theory.

Take, for instance, the tiger, considered to be a champion idiot among animals with nothing to constitute his glory except his immense strength and unparalleled ferocity. Even he has an idea of the passage of time. He knows when it is nearing midnight, when it is past midnight and when dawn is approaching. The sambhar and the boar, the cheetah and the bear, the hyena and the jackal, and, in fact, all night-feeders and night-roamers have the time-instinct strongly developed.

To go into detail, if, for example, a tiger discovers by accident that a sounder of pigs cross a certain stream or pass through a certain forest tract about midnight, he will so time his movements as to be in ambush near that particular stream, or forest tract, precisely when it is nearing midnight and, we almost

[1] There is now a large library of books and articles on animal psychology.—ED.

# TO A KITE

FLY, fly O Kite, in the air,
Soar, soar, O Kite in the sky;
You are like my thought, for I too fly my thought
In the sky of imagination, watch it soaring high and high and amuse myself just as your flyer does.
Fly, fly O Kite in the air,
Soar, soar O Kite in the sky;
You are like my heart, for my beloved often
Fastens the thread of her eye-ray to it and keeps it flying in the sky of love.
Like your flyer too this is her most pleasant hobby.
Fly, fly O Kite in the sky,
Soar, soar O Kite in the sky,
You are like my soul—for my soul too while it flies in the sky of eternity is attached with a silken cord of love with the great Flyer.

D. M. MUNGIKAR,
IV YEAR CLASS.

measure;—and this is what Staneilovsky has done. His actors do not create the rôles;—his characters become exactly the rôles. This according to him is the true aim of the theatre.

## Florenz Ziegfeld.

Ziegfeld is perhaps the most widely known and famous of living artistic producers.[1] As far as it concerns the greatness of the work he can hardly be given a seat besides Craig, or even besides Staneilovsky; yet we see his influence overshadowing not only the stage, but the screen also. He selected musical romance and musical comedy—hitherto ignored as artistically the most trivial of the dramatic arts—for his productions, but he attempted to produce real art through them.

His field is no doubt very limited, nevertheless it gives him a chance of inspiring what might be called *Æsthetic Sense* in the people, making the art as amusing to the crowd as it is to the 'select few.'

He combines all arts in Dramatic Action,—the sombre poses of sculpture, the enchanting pageantry of classical painting, the lilting dreaminess of music, the dynamic force of the muscular dances, the heart-breakingly beautiful charms of the chorus; and with a sane æsthetic harmony, he creates an extravagant dramatic phenomenon.

The æsthetician in him reveals itself in every inch of his spectacular stage. The bevy of beauties he has selected for his *danse ensembles* cannot be rivalled by any other such group in any part of the globe. Even his *Follies* may be termed artistically designed.

These great men are neither the dramatists, nor the actors, yet they are superior to both. They are the epoch-makers of the stage.

[1] He has died as these lines go to press.—Ed.

AZIZ AHMAD,
IV Year,
*Osmania University College.*

should be in his work like God in creation, invisible and all powerful; he should be felt everywhere and seen nowhere.'

In short, he contrived to present the soul instead of the body, the spirit instead of the form, by representing the symbol of the soul or the spirit.

His ideas did not fail to produce gradually a revolutionary change in the technique of the theatre. He began his career as a producer in London in 1902, Handel's *Acis and Galatea* and Purcell's *Masque of Love* being his first productions. He made designs for the production of several of Shakespeare's plays, the most important of them was the design for *Hamlet.* Being Ellen Terry's son, he found a lot of chances to bring his designs into practice;—and his genius was always crowned with success. His chief work was done in Florence where he founded a school, and designed the memorable production of Ibsen's *Romersholm* in which Eleanora Duse appeared in the leading rôle. During his famous liaison with Isadora Duncan, he made designs for a few gorgeous productions in the various parts of the continent;—some of the designs were made for the Russian master-producer Staneilovsky, and did not fail to impress him.

## Staneilovsky.

Staneilovsky, the Russian master-producer, has neither the magnificence of Wagner's personality, nor the enterprising genius of Craig; yet he presented a system true, realistic, powerful, and full of life. His greatness lay in creating *Life* on the stage by making the very form a living symbol of the spirit.

In his productions the rôles were given to the choicest actors who had something in common with the characters of the play: so that they might feel and realise their rôles.

On various desks but in the same room, the actors had to read and re-read the parts they were given to pronounce, until the very spirit of the characters went into their souls, and thus when they 'felt the rôles', they used to get up beyond themselves, and rehearse the whole thing, becoming the very parts.

The realism thus achieved could not be attained by any other

The genius of Gordon Craig was the first to present, and to bring into practice a thing that was *entirely new* ; he was a sensation in the realm of theatre.

'The art of the theatre is neither acting, nor the play ; it is not scenery, nor dance, but consists of all the elements of which these things are composed : Action which is the very spirit of acting ; Words which are the body of the play ; Line and Colour which are the very heart of the scene ; Rhythm which is the very essence of the dance.'

This is what Gordon Craig says with a sincere vehemence in his *Art of the Theatre* ; and then he sums up the general outlines of the idea on which his theory is based.

'A theatre is a place in which the entire beauty of life can be unfolded, and not only the external beauty of the world, but the inner beauty and meaning of life.'

Arthur Symons shows us from a more elaborate and artistic angle, the medium of Craig's art in his *Studies in Seven Arts* :

'The aim of modern staging' he says, 'is to intensify the reality of things, to give you the allusion of an actual room, or meadow, or mountain. We have arrived at a great skill in giving this crude illusion of reality. Mr. Craig aims at taking us beyond reality ; he replaces the pattern of the thing itself, by the pattern which that thing evokes in his mind, the symbol of the thing. Mr. Craig, it is certain, has a genius for line, for novel effects of line. His line is entirely his own ; he works in squares and straight lines, hardly ever in curves. He sets squares of pattern and structure on the stage. This severe treatment of line gives breadth and diginity to what might otherwise be merely fantastic.

'Success of course in this form of art lies in the perfecting of its emotional expressiveness. The distinction, the incomparable merit of Mr. Craig is that he conceives his setting as the poet conceives his drama.'

Gordon Craig insisted on the destruction of the present system of the theatre, quoting from Eleanora Duse, 'To save the theatre, the theatre must be destroyed.'

He applied to the theatre these words of Flaubert 'The artist

The first part though not very important is the only intellectual record of the history of opera, in which Wagner discusses the art mediums of his predecessors:—Mozart, Rossini, Weber and Beethoven.

In the second and the third part of the book he presents his own theories that were received with unbounded admiration. All his theories were based on his definition of the stage:

'*The two factors of the stage are: Poetry, carried to its utmost limits in Drama; and Music carried to its utmost limits as the interpreter and deepener of Dramatic Action.*'

The element of recitative music (that may harmonize with the poetry, without crushing its force) was paramount in his compositions. He brought even the most unharmonious sounds within the range of music; thus giving it a universal circumference.

Another important change that he made in the stage arrangement was to conceal the orchestra from the audience, and thus to dwarf the great importance that was attached to the instrumental music.

In spite of the towering appreciations, Wagner's revolutionizing theories raised a storm of controversy; his opponents charged him with enslaving the art of music and limiting it to recitation, and mere imitation.

He was not merely a theorist, as his practical work proved shortly afterwards. He founded the Bayreuth Theatre, the most exquisite and artistic cradle of music the world has ever seen. It remained a Mecca for the pilgrims of art during his lifetime, and after his death the traditions were kept up by his wife Cosima, and his son Richard Wagner. The great dancer Isadora Duncan gave a series of memorable performances in accompaniment of the 'Bayreuth Melodies.'

## Edward Gordon Craig

A figure, by no means as magnificent as that of Wagner, but in theatrical history not less important, is that of Edward Gordon Craig.

# THE MAKERS OF THE MODERN STAGE

THE Theatre is a phenomenon which consists of various efforts that join together, creating a harmony to produce what may be called the 'Æsthetic stage effect.' The playwright, the actors, the scenario writer, the costume-designer, the stage director, the art director,—and if it is a musical play—the composer, the chorus, the orchestra, in short every kind of active human force that has a hand in the production, has a separate position too. But the premier honours go neither to the dramatist, nor to the actors; it is the 'Producer' that deserves them. By 'Producer' I mean the *Artistic Director* in whose hands rests the most important factor of the production, namely, the harmony of the whole play; and thus he occupies the position of greatest responsibility. He is the supreme force, all other elements of production being his tools. It must be remembered that Gordon Craig has a position of more importance in the history of the theatre than George Arliss or even Bernard Shaw.

In this short essay we cannot undertake the responsibility of tracing out the history of Art-directing; we can only discuss briefly the theories of the various modern heralds of the theatre.

## Wagner

The first great theorist who was also a great producer, and the founder of one of the most famous schools of Dramatic productions, is Wagner.

With his *Nibelungen Ring* begins a new chapter in the history of opera. Being an excellent musician, a gifted literary figure, and a sane stage technician, he managed to open a new era in the kingdom of the theatre.

The most important of his works on the dramatic technique is *Opera and Drama*, a book in three parts, that deal with (*a*) the art and history of opera, (*b*) the play and the nature of the dramatic poetry, and (*c*) the art of poetry and tone in the drama of the future.

# FAITH

WITH science and knowledge lured I far scanned
Nature ; Evolution its tale of ocean, primitive
Its life on land, the ice-age grip and the Brontosaur,
The flower's birth and the bird's coming, the triumph
Of the mammals, Man's origin and the social
Evolution to me disclosed, but yet I felt, how
Protoplasm was from the lifeless matter stirred
And into cells formed. Its heat and chemical changes
Life evolved, but what of Heat and Chemistry
Who made Heat and Chemistry ? Where was the first
Start ? Fly to space and contemplate awhile :
Whose organic Power fashioned the spiral nebulæ ?
The Philosopher, a wreck on the shores of thought,
Meekly the life of matter and value asserts.
Goodness, Truth and Beauty, life's æsthetics are.
And into them our human life would turn.
Laugh poet and say—but what of those who died
Millions of years gone by ? Evolution
Born of rolling years, countless living things engulfed,
And knowledge would devour evolution in countless years ;
Yet the scientist, the philosopher, the astronomer
The biologist and the surgeon, the archæologist,
Will enjoy knowledge of value. Will all life
Dissolve into science ? Never. Then what of the rest ?
The globe with life clipped fairly breathes
The air and drinks the water, uses the earth and enjoys
The heat, but only Europe Radium and X-Rays knows.
One-third of the wide Universe uses the plane,
The crane and the ship, but the whole universe lives
Is science and knowledge thus for the few, and Faith
Whose wide arms the whole creation embraces
To shatter in the dust !

M. A. QAYYUM KHAN, M.A.,
RESEARCH SCHOLAR,
*Osmania University College.*

for that would give rise to rivalry, quarrels and misunderstandings. But in the other case more than one Wazîr might be appointed. They might be entrusted with the work collectively, as was done in the case of more weighty affairs, or they might be employed for special and well defined work.[1] But here, again, was the danger of misunderstandings. On that account, writers on political science have generally forbidden the nomination of many Wazîrs, and have allowed it only in two cases: first, as the Wazîr of a particular locality, and some province, as Egypt or Iraq, might be assigned to him; or some particular branch of administration might be entrusted to him. One might be appointed for military affairs, another for taxation and so on. In the first case the Wazîr would be like an old Persian satrap, while in the other he would resemble the Minister of a modern State.

This office was conferred directly by the Caliph himself, and, except in this instance, there was absolutely no formality in the appointment of any other official. The oriental potentates were, more or less, of retiring habits. They came very little in contact with the world, their intercourse being limited to a small circle of persons. Even to them they expressed themselves by gestures, or in short, laconic sentences. It is, again, a fertile field for controversy among the Muslim jurists, whether the appointment of a Wazîr was enough, if made by a gesture, or an express order was necessary.[2]

The Wazîr could be dismissed only by the Caliph, who was an absolute sovereign, and could dismiss all his servants according to his own opinion. Generally in the whole of the Muslim political organization there was not a single official who was not removeable. Even the magistrates and the religious leaders could not claim the privilege of being permanent. There is only one instance in the whole of Muslim history, where necessity was made a virtue. It happened in approximately recent times, when Muhammad 'Ali Pasha opposed the Turkish Sultan and was appointed to a permanent post.

[1] Mâwardî, p. 44.  [2] Mâwardî, p. 38.

MOHD. JAMILUR REHMAN, M.A.,
*Professor of Islamic History.*

to collect land revenue, the tenth, the poor tax or such other duties which are paid only by the Muslims.' [1] To support his assertion, he quotes a passage from the Quran, which, in general, disallows an intercourse between the Believers and the unbelievers. It would be presumptuous on our part, if we were to give our decision about a subject which has divided the learned Muslim jurists into two opposite camps. But we might remark that probably a misunderstanding has always existed about this matter. For, from what Mâwardî has said, it is clear that the second Wazirate was not quite truly official in the sense of Islamic political laws, but, on the contrary, the second Wazîr was a kind of a commissioner. Mâwardî observes the same thing, and says that this office was not conferred by formal investiture and installation[2], as was otherwise essential in the case of the other Wazîr. Also, his assertion, which is not contested, is that this office could be held even by a slave, who was otherwise formally debarred from other services. As the second Wazîrate was not officially recognized and yet had great importance in official circles, it would not be wrong to entrust it to a non-Muslim, who would come into contact with Muslims in the performance of his manifold duties.

Both the kinds of the Wazîrates, as we now clearly see, held out together and completed each other. They throw a sidelight on the Caliphate itself. But as the Muslim empire expanded, and the volume of work increased, it became difficult to rule it with the help of even two Wazîrs. It was then thought necessary to invite the co-operation of more persons for the proper execution of government decrees. And as, occasion rose, more than two Wazîrs were appointed. But it was not possible to have two Wazîrs, who might represent the Caliph fully and independently,

(1) ولا يجوز تولية الذى فى شئ من ولايات المسلمين الا فى جباية الجزية من اهل الذمة او جباية ما يوخذ من تجارات المشركين فاما ما يُجبَى من المسلمين فى خراج اوعشر او غير ذلك فلا يجوز تولية الذمى فيه ولا توليتهٗ.........................شئ من امور المسلمين *
See كتاب تحرير الاحكام فى تدبير اهل الاسلام of which Hâjî Khalfa has spoken in great details (vol. ii, p. 210). Yet Flügel has omitted all this in his Latin translation, especially the headings of the chapters leave much to be desired. The MS. which I have utilized is, to my knowledge, absolutely unique, and belongs to Kaiserl. Hofbibliothek of Vienna.

[2] Mâwardî, p. 41.

contact with the Caliph, as he did, a fine culture and great social talents were desirable and necessary in him. At the same time the qualities of conscientiousness, punctuality and versatility were indispensable.[1] Again, it was not enough for him to be a master of only one science, be it law or theology, or to have the knowledge of all the different departments of State, for he might be called upon to take part in any branch of knowledge, according to the wish of the Caliph. But such a versatile genius was difficult to find; hence the limitations of a Wazîr. Physical and mental fitness, especially clearness of mind, were thought indispensable for him. Morally it was thought necessary that he should be free from hatred, anger, corruptibility and frivolity.

The qualifications for this office being so high, and their possession being so strictly demanded, it is not surprising that some Muslim jurists considered this office to be open even to the non-Muslims. Mâwardî, who lived in the eleventh century of the Christian era, was the first person who gave expression to this idea.[2] It is easy to comprehend that such political liberality, which forms a strange contrast with the prejudices of the Christian Europe of even the nineteenth century, became an apple of discord between the jurists and canonists of Islam. While one school allowed it, the other censured it, and described it as an unpardonable fault.[3] Ibn Jimâ'ah, an author of the fifteenth century, speaks against the employment of protected non-Muslims as officials of a Muslim State. For, he says, 'It is forbidden to promote any one of the protected peoples in the Muslim State service, except for the collection of poll-tax and customs that are levied on the goods of the unbelievers. But any non-Muslim, who might seem to rank above the Muslims, should not be employed

[1] Mâwardî, p. 42. [2] Mâwardî, p. 43.

(3) وهل يشترط فى هذا الوزير الاسلام حتى لو اقام السلطان وزير التنفيذ من اهل الذمة كان جائزاً ام لا اختلف آراء الائمة فى ذلك فذهب عالم العراق الامام ابو الحسن على بن الحبيب البصرى رحمةُ الله الى جوازه و ذهب عالم خراسان امام الحرمين ابو المعالى الجوينى الى منعه وعدّ تجويز ذلك من عثرة لن تقال و خطاً فيما قال This is an extract from عقد الفريد of Ibn. Ṭalha, described by Ḥâjî Khalfa (vol. iv., p. 232). The MS. which I have used was brought out from the East by W. Graham of Bonn. The second chapter of this work, which deals of فى السلطنة والولايات (not as Flügel reads it الولاية) contains a short extract from the Politics of Mâwardî. But I could not take advantage of it for the textual criticism of the last named book.

not always bow down low on receiving rewards ; he who wins the hearts of men, through the magic of his speech, and the beauty of whose words captivates and subjugates the people.[1] '

The signet ring was the external mark of distinction of this office.[2]

Of less influence, and with limited authority, was the second Wazîr, whose business was in reality, only to execute the joint or separate decrees of the Caliph and his Grand Wazir. This office was not so much a real post of the Islamic State organisation, as it was an institution which acted as an intermediary between the highest and the lowest, official as well as non-official. He, therefore promulgated the decrees, announced the appointment of officials, proclaimed the preparations for war, and was the highest authority for the proclamation of all events of political interest. As he was also occasionally invited to the Council for consultation, his powers were not limited only to being a medium between the Caliph and his subjects, without his ever acting independently in his ministerial capacity. It should not be positively inferred that he had only a subordinate position. His importance stands out clearly by the fact that all the decrees, statements and appointments had to be attested by him, and without his signature they had no value.[3] The process was something similar to the rectification of decrees by the Chief of the State, in a constitutional government, through the Minister.

The difference between the two Wazîrs in their status and circle of work, naturally shows us the relation in which they stood to each other. It is evident that so lofty had become the status of the two Wazîrs, through their contact with all the affairs of the government, and through their personal touch with the Caliph, that, by reading books on the subject, a man could only form a hazy idea of their official importance. Then, again, the question rises : how would all the necessary qualifications serve him in his official capacity? for he found very little opportunity of using them. But it must be remembered that, coming in personal

[1] Mâwardî, p. 34.
[2] Ibn Badrûn, ed. Dozy, p. 244.
[3] Mâwardî, p. 41.

courtier, and must know how to amuse and entertain his master. If the master, at a time, requires intellectual food, he must understand how to administer it ; if he wants to be amused, the Wazîr must become a *maître de plaiser.* He must be a perfect master of what the Arabs called *Adab*, and is known among us as 'perfect education', or, as the Arabs say, 'he must be conversant with chess, the harp, polo, mathematics, medicine and astrology ; furthermore, must understand poesy, grammar and history, and, last but not the least, must be able to recite poems and stories'.[1] These qualifications have given rise to a number of books, which treat of the instructions to the Wazîr, but which are not, for a greater part, very important from the practical point of view. On the contrary, they speak about the general manner of speech, and set forth the admonitions in an unctuous and aphoristic style. Of this kind, for instance, is the book the *Principles of the Wazirate*[2] by Mâwardî. Looking at the name of the book, a man would think that he could get something useful from it ; but in reality it was a superfluous book and could lay claim only to linguistic interest. Unlike this, on the contrary, is the important book, the *Guidance of the Wazîr*,[3] for it contains, in a concise and yet encyclopædic form, things worth knowing about all the spheres of Islamic culture, and may be read with great advantage. In short, laconic sentences, and not without a poetic touch, the Caliph Mâmûn expresses himself as follows about the choice of a Wazîr : 'I want, for my help, a man with all human virtues, pure of heart, straightforward in his dealings, trained by learning, made wiser by experience, proved and tested as a confidant, ever ready to carry out orders ; who is silent by sagacity, and knows how to converse about knowledge ; for whom only a look is sufficient, and to whom a sign suffices ; he who has the energy of a general, the seriousness of a magistrate, the humility of the learned, and the acuteness of a jurist ; he who is grateful for favours, and is steadfast in misfortune ; he who does

(1) وقال ذو الرياستين الادب عشرة اشياء ثلاثة انوشيروانية وثلاثة شهر حبية وثلاثة عربية وواحدة فاقت عليهن كلهن - فاما الثلاثة النوشيروانية فلعب الشطرنج والضرب بالعود والضرب بالصوالجة واما الثلاثة الشهر حبية فالهندسة والطب والنجوم واما الثلاثة العربية فالشعر والنحو وايام العرب واما الواحدة التي عليهن كلهن فمقطعات الشعر والسمر - See كتاب ادب الوزراء, fol. 6 r.

(2) قوانين الوزارة.

(3) كتاب ادب الوزراء,

of the Wazîr, then his orders remained in force, while that of the Wazîr were annulled *ipso facto*.[1]

From this short account of the powers of this Wazîr, we can clearly see that his personal position was the same as that of the Caliph. The only difference, in this respect was, that as the Wazîr was a personal servant of the Caliph, no importance was attached to his family connections at the time of his appointment, while the Caliph must belong to the tribe of Quraysh. All the other remaining qualifications were the same for the Caliph and the Wazîr. When the Caliphate ceased to be an elected institution and became limited in particular dynasties, the Omayyads and the Abbasids, it quite frequently happened that in order to decide about the occupant of the throne the least possible requisite qualifications were required, and family connection became the chief thing to raise a man to the Caliphate. Under the first four Caliphs, who were all elected to rule over the people, we find no trace of the Wazîr. They were, on the whole, such efficient men that they could easily dispense with outside help. The Wazirate first came into view at the end of the Omayyad period, and attained its highest glory under the Abbasids. The Wazîrs were then the real rulers, and eclipsed their masters, who had by now become estranged from all the various affairs of the State, and passed their time in the *harem*, amusing themselves with their male and female slaves.

Great and numerous were the qualifications which the Wazîr was expected to possess, and we know from history, cases where individual men filled this high post with such distinction that they not only earned the approbation of their masters, but also the love of their subordinates. Such were the Barmecides, whose tragic end has made them famous; and in still later times the Koprili of Turkey, who gained laurels in civil and military administration, and who on the one hand maintained intimate relations with their masters, and on the other, earned the love and esteem of the people. But what makes the office of the Wazîr still more important, is the condition that the Wazîr, besides other qualifications, should also possess the attributes of a perfect

[1] Mâwardî, p. 40.

officials differed in their rank, functions, and the qualifications required for each of them.

The absolute and all powerful helper of the ruler, who, in later times, came to be known as Grand Wazîr, occupied the most important and influential place among the officials of the State. He was the *major domo* and *alter ego* of the Caliphs, from whom he differed only in name. The power and authority which this Wazîr possessed, often rose above that of his master. From this very fact we can form some idea of his official powers. He exercised, in fact, the full authority which the Caliph himself possessed, and was only bound to keep him informed of his decrees and arrangements, so that his dependence on the Caliph might be manifest to the people.[1] The Wazîr had the authority, like the Caliph himself, to take up all the affairs of the State, no matter to what department they might belong; and could see to the rectification of those affairs personally or through his nominated officers. In short, he was empowered with all the authority which the Caliph himself possessed, with the exception of three things: (1) the Wazîr was not allowed to nominate his representative or successor, for he was a personal official of the Caliph; (2) he could not be dismissed by the people, for he acted in the name of the Caliph; (3) he could not, without special permission of the Caliph, dismiss or remove any of the officials appointed directly by the Caliph.[2] In all the remaining matters he was allowed such a free hand that the Caliph himself, in most cases, had no right to reverse or remit the decision of his Wazîr. But the Caliph had the unquestionable right to dismiss the officials nominated by the Wazîr, and even to modify or annul the measures passed by the Wazîr, respecting civil or military administration. Then, again, it was not the Wazîr, but the Caliph who was wholly responsible for all the affairs of the State. In case there was difference of opinion between the Caliph and the Wazîr, the question was decided by priority, provided that none of them had a knowledge of the other's decision. But if the Caliph was present on the occasion and gave his decree contrary to that

[1] Mâwardî, p. 38.

[2] Mâwardî, p. 39.

been put forward to explain this word.[1] In the first place, the idea is said to be taken from 'recourse'[2] that is, 'he to whom the Caliph has recourse'; then, again, the idea is connected with the vertebral column,[3] because, the Caliph through the help of the Wazîr, remains erect, just as this column keeps the body erect. But more probable, and the one more adapted to the position of the Caliph, is the third explanation, which is also preferred by Bayḍâwî.[4] According to him, the word Wazîr connotes the idea of burden,[5] that is, 'he who shares the burden of the Caliphs,' 'a helper, coadjutor.'

This word is also used in the *Koran* (Sura 20, 30–35), where Moses turns to God with the prayer to give him his brother, Aaron as a fellow-worker and a colleague. 'And make for me a *Wazîr* from my people—Aaron my brother; gird up my loins through him; and join him in the affair, that we may celebrate Thy praises much and remember Thee much.' This passage of the Koran shows that the appointment of the Wazîr is not only allowed but commended by the Law. Moreover, it is absolutely impossible for the Caliph to fulfil all the obligations of ruling the State and the Church single-handed. So he partially transfers his powers to another person, and shares the responsibility with him, in order to manage the affairs better and to obviate the danger of mistakes. Here it might be pointed out that in Islam the Church and the State are identical. They are only the two sides of the same thing, and govern the whole life of the individual as well as of the society.

The Muslim jurists differentiate between a full or absolute, and an imperfect Wazîr with limited authority, who represented the Caliph in full, or only partially. The first Wazîr is called the وزير التفويض (i.e. the plenipotentiary in ruling) and the other وزير التنفيذ i.e. one who only executes orders from the ruler.[6] Both these

[1] Mâwardî, p. 38; the same in قوانين الوزارة. MS. in the Royal Oriental Academy of Veinna, No. 195 (473); fol. 8r.

[2] الوَزَر = الملجاء, Sur. 75, 11.

[3] الأزر

[4] Sura 20, 30.

[5] الوزر

[6] Mâwardî, p. 33,

he also represents him on certain occasions. This institution, in the form in which it was adopted in Islam, was borrowed from the political life of Persia. In the *Book for the Guidance of the Wazîr*,[1] it is said: "The Persian kings held their Wazîr in such an honour, as no other [king] ever did. They used to say, 'The Wazîr is the director of our business, the ornament of our kingdom; the tongue by which we speak; and the weapon which we hold ready to reach our foes in far off lands'." We can see from this description not only that this institution was a permanent feature of the Persian political life, but also how wide was the authority with which the bearer of this office was invested. From Persia this institution was taken over by those small kingdoms of the pre-Islamic Arabs, which flourished in the north and the south of the Peninsula. Jauharî gives the most detailed description of it among the pre-Islamic Arabs.[2] "The post of *ridf* ( ردافة ) exists for the following purpose: When the King sits (in audience) the *ridf* sits on his right hand, when the King drinks, he drinks before all others; when the King goes to war, he takes his place, and fills it till his return; when the army comes back, he is entitled to the fourth part of the booty." According to Jauharî, in the kingdom of Hîra, situated on the Persian frontier, this office was hereditary in the tribe of Yarbû' ( يربوع ), who had been invested with it, because they had renounced all claim to the throne. Here, again, we have another proof of the Persian origin of this office; for, according to Procop's account, the heredity of office was a peculiar characteristic of the Persian system of government.[3] We can quite easily see that the kingdom of Hîra, being situated in the neighbourhood of Persia, and thus being open to foreign influences, must have taken over this institution from it. Among the Muslims the name of this office was changed. The holder of it was no more called a *ridf*, but became known as a *Wazîr*. Three etymologies have

(1) وكانت ملوك الفرس يرون الوزراء بمنزلة لا يراهم بها احدٌ سواهم ويقولون الوزير نظام امورنا وجمال ملكنا ولساننا الذى ننطق به وعُدّتنا التى نعتدها لنتاول عدونا فى الارض النائبة [النائية] See كتاب ادب الوزراء fol. 3 r. Mâwardî, p. xiv.

[2] MS. Gotha, 477, fol. 13 r.—14 v. The passage is also quoted by Harîrî, ed. de Sacy, p. 278.

[3] De bello persico, I., 6.

# THE WAZIRATE[1]

THE first successors of the Prophet Muhammad were very efficient men, and strove in every way to fill their posts with distinction. They were not only the generalissimo of the Muslim army, whose conquering expeditions soon extended over Persia and Egypt, and beyond them to India and the Western lands, but were also the religious leaders of the faithful, and performed the highest religious functions personally. Under these circumstances they had occasion to lay down the laws, and decide the cases that came before them.[2] On the whole there was no branch of administration which was excluded from their care. Indeed they were in direct personal touch with the farthest parts of their State, and, from their residence, kept a watch over all their officers. But with the extension of Muslim empire, which in a short time grew to be the greatest and the mightiest that the world had ever seen, there must have been felt the need of some kind of representation, to help the ruler in coping with the vast volume of work, which could not now be handled singly. At the same time, by the conquest of Syria and Persia, the Muslims had an opportunity of studying the political institutions of the Greeks and the Persians ; for they were the two nations who had, from quite ancient times, created these institutions, and had preserved them upto the time of the Muslim conquest. Fortunately for the Muslims, the conquest and subjugation of these nations under the might of Islam, occurred at a time, when there was at the head of the Muslim State a man distinguished for his tact and energy and singularly free from prejudice. This was Caliph Omar, who adopted and introduced everything that he found useful in the subjugated nations, and assimilated it in Islam. Omar was thus the real founder of the political institutions of Islam.

Naturally, the function of the representative of a ruler is not only that he helps and advises him in administrative matters, but

[1] Adapted. *Vide Z. D. M. G.* vol. xiii. (1859).
[2] Mâwardî, p. 129.

acre. For this the Commissariat of Agriculture is made responsible, but in practice the authorities found that in agriculture they had to overcome weather conditions over which they had no control. These difficulties, however, are met, to a large extent, by the establishment of big estate-farms and by the introduction of collective farming. Thus the Soviets have attempted to eliminate the problem and the danger arising from rich peasants who stand in the way of collectivising agriculture. Simultaneously with this, they have also introduced machinery, the workers following behind in caravans the tractors and combines. All this resulted in the decrease in the cost of cultivation. They are also able to have fixed stable prices and large profits. But at the same time the idea of profits is altered. There were no huge gains or losses. Whenever there are gains, they are distributed in the whole industry in question. Thus a part is used for the cultural benefit of the workers and a part is taken by the State as a kind of tax and profits by the State; a part for increasing the capital of industry and the rest taken by the State. The Five Year Plan therefore demonstrates two things, that machinery can be used to improve the standard of living without at the same time involving a degradation of life. Secondly, it shows that there is less wastage and consequently a higher standard among all the people. The Soviet government have given their people a new energy and enthusiasm; they have proved that the State exists for the service of the individual and finally they have made the individual himself centre his interest in the community and it is this which seems to prosper Russia.

MIR MAKHDOOM ALI KHAN.
V. YEAR (HISTORY),
*Osmania University College.*

# THE FIVE YEAR PLAN

THE great object of the U. S. S. R. is the establishment of a classless society which is to be based on collective ownership of the means of production. Russia has undertaken with the aid of a new socio-political instrument to do something on a large scale concerning the very complex policy of national development. The Five Year Plan is intended to achieve this. Its being can be dated back to the year 1921, when the first legislation was passed by which a State planning commission was set up. It was to work out a single nation-wide economic plan and also to work out the pressing economic task of the immediate future in the fullest detail; thus there are two categories of work. One belonging to the general future and the other belonging to the calendar year. The first contains the objectives and hopes of Russia and the second carries out the mandates given to the operating units. After 1924 the Gos-plan developed for the whole of the U.S.S.R. a series of one year plans. This continued till 1928, when it was succeeded by the famous Five Year Plan.

The Supreme Economic Council and the Commissariat for Supplies are the two government departments which deal with the industrial production. The latter being in special charge of all questions of food production. In each important industry there is one great combination to buy the raw material and sell the final product. It also directs a group of factories but each individual factory is reponsible to the particular combination to which it belongs. This involves the double principle of corporation and combination and therefore has helped Russian industry to a large extent.

There is also the problem of agricultural reconstruction since Russia is, like India, an agricultural country and since the peasants had a lot to do with the Revolution. With the nationalization of land, large estates broke up into self-sufficient holdings. The Five Year Plan provides for an extension of the amount of land under cultivation and also for an increase of the yield per

enthusiastic letters. 'In his face,' she dreams, 'the whole world plays to me,' and 'it outshines all the wisdom of the world.' Romantic and fantastic is also the clever Rubel who saw him three times and cherishes no other wish than that Goethe should live to see himself loved by his contemporaries with their judicious hearts, idolized and acknowledged, studied and understood.

Recognition came from foreign lands. The eighty-year-old Goethe observed with pleasure: '*Helena* in Edinburgh, Paris and Moscow.' The second part of *Faust* was taken notice of in an English, French and a Russian newspaper. Three translations of the first part were already before him in French. And the reviewer in Edinburgh is the great Scotchman Carlyle, who writes to the German poet of his hope to see him face to face and to unbosom as before a father the sorrows and deviations of an afflicted heart. Carlyle's wish that his life should remain long, long after as a source of consolation and instruction is fulfilled not in letter but in spirit. Through Goethe German literature makes its debut in the literature of the world with dazzling grandeur.

S. VAHIDUDDIN,
V. YEAR (PHILOSOPHY),
*Osmania University College.*

notorious *Faust* owes its undeserved celebrity to the vulgar taste of the obscurantists. He is here at one with Herr von Kotzebue who labelled *Faust* as a 'rugged masterpiece' and thereby did not conceal his personal enmity with the Manager of Weimar Theatre and Privy Councillor.

The resentment of his adversaries began to grow unchecked. The year 1821 saw the publication of a spurious *Wanderings of William Meister* by Pastor Pustkuchen. He sees in Goethe - 'The representative of wicked, formless, dissolute modern times'. 'Never has he grasped what fidelity means'. He can only paint in lively colours the disgraceful, inconstant and unbridled life. Prof. Köchn and Heinrich Vogler delivered a dissertation on 'Goethe as a Man and Writer', and pretended that it was an adaptation of an English pamphlet by Clover. Goethe is there depicted detestable as man on account of his dangerous propositions and immoral politics. He indulges himself in trifling quibbles. He has now become too old to write and hence drivels at random in the weakness of his age. His autobiography teems with coarse vulgarisms. 'He strips himself stark-naked and thus exploits the public of their money.' Being an egoist he concentrates himself on his own person. His conversations are directly nauseous and offending to the ear.

Amidst this chorus of hatred the voice of love stands out more prominent. Little by little the view of Goethe becomes clearer and the clouds of the present hanging over him dissipate before the light of the future revealing continuously his whole work. In the beginning the younger generation of poets took pleasure in dethroning the Olympian Zeus of Weimar. The invalid Hardenberg, Novalis, laughed at *Wilhelm Meister*: it is to a certain extent prosaic and modern. Dorothea Schlegel had the audacity to talk of the poet as a 'vulgar and flat Goethe'. But the Romanticists become bored by the very same *William Meister*, of Mignon and the Harper, of their charm and their music, that extorted great admiration from Friedrich Schlegel. 'Golden fruits on silver dishes,' says Friedrich in the *Atheneum*, and proclaims Goethe 'the Governor of Poetry on earth'. The romantic Bettina dedicates to him fifty years after his death her

Its fame spread throughout Europe and into the farthest lands. A German sees in the captain's cabin of a trading vessel a Chinese painting with the figures of 'Werther's Sorrows'. 'What strikes me', sighs Goethe in his Viennese epigrams, 'is that even the Chinese paint Werther and Lotte with uneasy hands on a glass!' The artillery lieutenant of Napoleon Bonaparte read the sentimental romance seven times with hectic excitement. But the Werther fever caused also a reaction, a flood of moral revolt. *Stella*, the work of his twenty-seventh year was denounced as a despicable play because of its advocacy of polygamy, as 'Werther' was as a school of suicide.

In the year 1800 Klopstock comments upon *Iphigenia*, but only to deprecate it maliciously. 'It is a lifeless imitation of the Greek. Besides, it abounds in dialogues that can hardly be read through. And then look at the structure of the verses!' *Egmont* also displeased the reviewer of the *Allgemeinen Literatur-Zeitung* in Jena. 'This tragedy is said to have no dramatic plan. The poet has tinctured Egmont with his own traits in order to bring him down to our own level. He makes him a lover of common calibre, and suffers him no eminence. The result cannot be otherwise than a somersault in the opera-world.' The reviewer is no other than Professor Schiller (who has not yet become Goethe's friend). 'Goethe's *Tasso* is on the whole imperfect', so declares the *Neue Biblothek*. It charges the author of *Geschwister* with 'negligence in expression'. 'The language is not wholly pure' is the verdict of the dramatic critic of Mannheim. *The Natural Daughter* was condemned in the same city on the ground of the marble-like frigidity of its verses. *Hermann and Dorothea*, too, does not find favour with the *Neue Biblothek*. Goethe's lyrics by no means produced any effect on his contemporaries. They have insipid and stiff rhymes and nothing of the real characteristics of true poetry. *The Bride of Corinth* is provoking, the erotic *Roman Elegies* vulgar and hackneyed. *The Elective Affinities* does not avoid the ludicrous. *Faust* has 'wretched rhymes', 'sheer sound and fury', 'a long litany of nonsense', 'a diarrhœa of indigestible ideas'. Franz von Spaun, the man who called the Prologue an arrogant fatuity, immortalises himself in remarking that the

as a research worker that he staked his name. He was to a certain extent proud of his Colour Theory which only he regarded as the true one. The young Goethe had already intoxicated the minds through his *Götz and Werther.* The forty-year-old man who has just returned from Rome, the creator of *Iphigenia, Egmont, Tasso, Wilhelm Meister* feels a strangeness growing between his Weimar days that had banished him to the small Thuringian city with its society of courtiers and the genius lurking within his breast. The friendship of Schiller inspired him with new ideas of creation on the one hand; on the other it diverted his attention from natural sciences to contemplative ones. Three years after Schiller's death he got *Faust: A Tragedy* printed, which is a later remodelling of the drama that he had planned in Frankfurt, shortly before his arrival in Weimar while he was greatly convulsed by the passions of youth. He steadily clung to his chief occupation to the last. The second part of *Faust* was not fully ready when he died. He is, indeed, a Lear who has played himself out.

A generation has past since the time of Schiller, since the time over which Schiller's widow said: 'How like burning meteors vanished together both of them, the one comprehending the other flame without destroying itself!' 'Do preserve yourself for us, my dear', wrote to Goethe Wilhelm von Humboldt, bemoaning Schiller's loss. 'Once we lose you all is darkness and confusion round and about'. But such a voice of unconditional admiration is rare in Germany. The old Goethe holds fast that the whole hostility of all daily and weekly papers, whether overt or secret, malicious or violent was set against him at the time. It was simply a repetition of what he had experienced in the foregoing decades. The only difference was that it did not inflame him as before.

The captious criticism even of *Götz* was not lacking. If Frederick, the King of Prussia, condemned the book as an abominable imitation of a bad English work and complained of its 'repulsive banality' in his French work on German literature, so has Lessing thundered against it and stigmatised it as 'a gut full of sand'. Werther produced a fever infecting one and all,

vitiates Kantian ethics and æsthetics and glorifies one of the most self-centred men of the world, the man in whom the most uncompromising kind of individualism is sublimated and tempered by the glamour of that love which seeks to transcend the finitude of man's existence through his own expansion and externalisation. Goethe's Faust, Mephisto and all his creations are no other than Goethe's own personality unfolding itself in different directions. Such is the tragedy of life that we mortal millions cannot go beyond our own self.

As Goethe's centenary was lately celebrated throughout the 'civilized' world we have thought it worthwhile to translate an article from his own countryman which succinctly shows the chasm that yawns between his contemporaries and his present day admirers. Never was it more imperative than in these days of petty 'Vaterlanderei' to live in his 'wide and luminous view'. How ironical it is that a Europe sunk as it is under the self-imposed burden of reparations and war debts, rent by racial and geographical boundaries, dreaming sometimes of a federation of Europe, sometimes of a Danubian confederation, but never of universal brotherhood, should have the courage to pay homage to the poet in whose philosophical Pantheism all differences of race and creed were indistinctly merged. When we are marching on our weary way, Goethe, let thy spirit shine as a beacon guiding us from falling into pitfalls and sinking back in blank despair and negation !

S. V.

---

In the 86th year of his life, a century ago, Goethe died in a house at Freuenplatz in Weimar. Was he the acknowledged national poet? He himself hardly believed in his increasing solitariness. Bitterly enough has he written down the words : 'There cannot be any greater consolation for the common man than that even the genius is not immune from death.' His collected works in the eight volume edition of 1787 to 1790 were bought only by six hundred persons, and little was the sale of the special edition. 'Of all the feats' so he confided to Eckermann, 'that I have performed as a poet I attach importance to none'. It is only

# GOETHE AND HIS CONTEMPORARIES

BY

**Hans Wiegler** [1]

WHEN Goethe's death was told, we said:
Sunk, then, is Europe's sagest head.
Physician of the iron age,
Goethe has done his pilgrimage
He took the suffering human race,
He read each wound, each weakness clear;
And struck his finger on the place,
And said: Thou ailest here and here!

M. ARNOLD.

When Goethe's temporal life was about to end he cried for light and more light. As we are still groping in the dark, still baffled by the same problems, still haunted by the same mysteries we shall do well to bear in mind his last words with all their profundity. His was, indeed, the life spent in welding the heterogeneous and contradictory elements of his multi-faceted self into one harmonious whole, into one organic unity. Let his fame as a poet, as a scientist and as a thinker rise and fall with the whims of the passing generations, the push that he has given to humanity can never be over-estimated. As all our life is the arena of antagonistic forces at deadly set against one another it gives a concrete form to the old legend of Adam and Satan. This conflict is beset with such risks that it may end in a pathological derangement of the subject. The glory of Goethe lies not in his vainly trying to eradicate the Satanic within him and thus suffering it to crop up later to the disintegration of the ego but in absorbing and transforming it. In approaching his tempestuous life let us boldly do away with that 'disinterestedness' which

[1] Translated from the original German article of Hans Wiegler (*Berliner Illustrirte Zeitung*).

## CONTENTS.

### *Vo. V, No. 4.*

# EDITORIAL NOTE

THE annual reports of different Associations must reach the Magazine Office as early as possible so as to be arranged in the following order :—

(*a*) Union Society.

(*b*) Games and Sports.

(*c*) Hostels—

(*d*) Languages—Bazme Adab, Arabic Association, Marathi Association.

(*e*) Science—Scientific Association.

(*f*) Theology.

(*g*) Historical Society and Association of Economics and Sociology.

(*h*) Law Association.

What a fine and masterly picture of a loving sweetheart!

To such a one perhaps is offered S. Lover's invitation:

'Come live in my heart, and pay no rent.'

The same poet pays tribute to a gentleman's true love:

'Down on your knees,
And thank heaven, fasting, for a good man's love.'

(*As You Like It*, Act iii. 5)

The lover's confessions are like angelic words to the attentive ears of the beloved:

'How silver-sweet sound lover's tongues by night,
Like softest music to attending ears:

(*Romeo and Juliet*, Act ii. 2)

Enamoured with the wine of love in youth T. Moore passionately exclaims:

'No, there's nothing half so sweet in life
As love's young dream.'

So, young as we are, let us now close our eyes with such a 'Love's young dream', and try to suck up the cool nectar that the poets' enchanted cup has so generously offered for our pleasure.

(*To be continued*)

M. A. QAYYUM KHAN, M.A.,
*Research Scholar.*

Now we come to a few lyric utterances on the same subject, presenting to us its different aspects.

> ' God gives us love. Something to love
> He lends us.'
>
> (Tennyson)

The same poet wisely suggests—

> ' For in a wink the false love turns to hate

That is a good standard to judge true love. We have a sweet song of Shelley, the ' poet of Light.'

> ' All love is sweet,
> Given or returned. Common as light is love,
> And its familiar voices wearies not ever.'

From Love in the abstract we now turn to Love in the concrete. In the words of Tennyson, as quoted above, ' God gives us love. Something to love He lends us '.

Among the sweethearts of man there is nothing so sweet and balmy as the woman. To this fair creature poets have offered the noblest tributes of their hearts. They have elevated her birth and station in life, made her a princess of beauty and crowned her with the greatest art of Nature. Therefore their lyric songs of love, despite being genuine, lively and enervating also embrace the psychological aspects of the mind. Love poetry is the epic poem of man's soul, and the love songs are annotations of the æsthetic and ethical nature of man.

To begin with, I would quote a fine passage from Shakespeare wherein he depicts the character of a clever heroine. Says he :

> ' She never told her love,
> But let concealment, like a worm i' the bud,
> Feed on her damask cheek ; she pined in thought ;
> And with a green and yellow melancholy,
> She sat like patience on a monument,
> Smiling at grief.'
>
> (*Twelfth Night*, Act ii. 4)

when science holds the Sceptre and philosophy the Crown but matter rules the World, we have a voice from heaven calling us towards Love—The mighty spiritual warring with the 'dullness of matter'. Should we answer it we would at least reap the harvest from all that intellectual labour we have been doing for the greatest good of mankind: we would gain elevation and peace.

What makes Love dethrone all spiritual forces, and offers it the loftiest seat in the universe is ultimately its quality of being immortal. It is indestructible, eternal and everlasting. When everything perishes Love alone survives. Southey refers to this quality of Love in a fine poetic way:

> 'In Heaven ambition cannot dwell,
> Nor avarice in the vaults of Hell:
> Earthly these passions, as of Earth,
> They perish where they have their birth.
> But Love is indestructible;
> Its holy flame for ever burneth,
> From Heaven it came, to Heaven returneth.'

Tennyson echoes the same sound when he makes Love speak to Death—

> 'The shadow passeth when the tree shall fall
> But I shall reign for ever over all.'

Here is another musing upon Love—

> 'In peace, Love tunes the shepherd's reed;
> In war, he mounts the warriors' steed;
> In halls, in gay attire is seen;
> In hamlets, dances on the green,
> Love rules the court, the camp, the grove
> And men below and saints above;
> For love is heaven, and heaven is love.'

Such universal appeals are the very wings of inspiration and progress. If rightly considered they would offer sublime thoughts of the divine and make the soul stoop to the blessings of God.

Phillips James Bailey contributes a beautiful passage to the divine conception of Love—

' Love is the happy privilege of the mind—
Love is the reason of all loving things.
A Trinity there seems of principles,
Which represent and rule created life—
The love of self, our fellows, and our God.
In all throughout one common feeling reigns :
Each doth maintain, and is maintained by the other :
All are compatible—all needful ; one
To life,—to virtue one,—and one to bless :
Which thus together make the power, the end,
And the perfection of created Being.'

Created life has three principles—the love of self, our fellows and our God. How sweet a message to the world contending for peace! Love is the reason of all living things' and 'the perfection of created Being'. There is a volume of thought within these short poetic utterances—they are the all-embracing words of truth. We, the philosophers, the scientists, the historians and the politicians are unanimously seeking for a route to perfection. We are expounding theories, cutting down principles and recording the ways of life. Yet above such dogmatism soars the ethical and the spiritual value of things. The poet sings of these and drugs us to sweet celestial sleep.

' Love,—what a volume in a word, an ocean in a tear,
A seventh heaven in a glance, a whirlwind in a sigh,
The lightning in a touch, a millennium in a moment,
What concentrated joy or woe, in blest or blighted Love.'
' Love is a sweet idolatry, enslaving all the soul,
A mighty spiritual force, warring with the dullness of matter.
An angel-mind breathed into mortal, though fallen, yet how beautiful.
All the devotion of the heart in all its depth and grandeur.'

So this is an explanatory theme of love. In the present era

ings of Love. Therefore let us now pass on to that last point of the present article, which is the ruling Fate of the Universe.

Emerson in his essay on *Friendship* remarks.—'Love which is the essence of God, is not for levity, but for the total worth of man.'

Shelley in his *On Love* writes.—'What is Love? Ask him who lives; what is life? Ask him who adores what is God.'

With an introduction such as this, for we feel at a loss to dilate upon definitions and descriptions of love which are no more than partial truths, we now approach to its poetic conceptions.

'Yes, Love indeed is light from heaven:
A spark of that immortal fire.
With angels shared, by Alla given,
To lift from earth our low desire.
Devotion wafts the mind above
But Heaven itself descends in love;
A feeling from the Godhead caught,
To wean from self each sordid thought:
A ray of Him who formed the whole;
A glory circling round the soul.'

(Byron)

Reader! recapitulate in thy mind the universal truth that lies buried in these weighty lines. It is merely a mystic conception of love, but a piece of good augury for those who think and value the truth of things. Love is the prevailing spirit among the angels dwelling in the golden spheres of Heaven. In the vast celestial abode where the spirit of the dead will depart there will be only love and peace reigning. They are the glories of Paradise. Man's most valorous pursuit therefore should be to lift his life from low desires, and waft the mind to higher aspirations and lo! the poet welcomes us in those regions with the grand spirit of love. It is the 'light from heaven' and 'a feeling rom the Godhead caught.'

Here we have the peace and pleasure derived from beautiful things.

Beauty is the magnet which attracts human attention—nay, perhaps the sympathy of Nature. Says Milton:

'Where perhaps some Beauty lies
The cynosure of neighb'ring eyes.'

Consider how many things there are in the world which attract attention and inspire and you will comprehend the value of Beauty. It is genius personified, a glory condensed into vision.

'Beauty itself doth of itself persuade
The eyes of men without an orator.' (Shakespeare.)

In a fine fluent style Stephen Phillips remarks:

'As rich and purposeless as is the rose;
Thy simple doom is to be beautiful.'

Here is a version of Pope:—

'And beauty draws us with a single hair.'

Inspired with the Greek outlook on life—'A beautiful mind in a beautiful body', Shakespeare expects a lovely woman to be made of a nobler stuff. There is a fair lady, a gleaming expression of Beauty personified, and a fair soul tallying with her fair body:—

'There is nothing ill can dwell in such a temple;
If the ill spirit have so fair a house,
Good things will strive to dwell with't. (*The Tempest*).

From the realms of beauty we now come to the noblest blessing of life—Love. Beauty if rightly understood is the very soul of love. The universe where human life with all its ill and errors reigns supreme, presents as many aspects as the emotions of man. Human nature, weak and erring, is a victim to evil, and evil arises from erroneous conception of things. When all other powers fail, Beauty paints Nature into a gleaming glory, centralizes and beautifies the conceptions of man and consequently inspiring love among them brings them to the kingdom of eternal peace. Such are the powers of Beauty, such are the bless-

void of an æsthetic vision is an empty dream. Art is the handmaid of the pleasures of life, and unless man has moulded his soul to sympathise and admire Beauty in the universe he is hardly conscious of the greatest power of God, also is handicapped of an æsthetic pleasure. Conception of Beauty is not visionary, it is spiritual. To quote Oscar Wilde 'Beauty has as many meanings as a man has moods. Beauty is the symbol of symbols. Beauty reveals everything because it expresses nothing. When it shows us itself, it shows us the whole fiery-coloured world.' Ruskin in his *Ethics of the Dust* says, 'you ought to be glad in thinking how much more beauty God has made, than human eyes can ever see'. Spencer beautifully remarks: 'The saying that beauty is but skin-deep is but a skin deep saying'. W. Savage Landor holds the opinion that 'the sight of beauty, in her purity and beatitude, turns us from all unrighteousness and is death to sin'. Sharing the sentiments of such mighty thinkers, now let us turn to poets and hear the message.

Keats in his *Ode on a Grecian Urn* remarks:

'Beauty is truth, truth Beauty.'—that is all
Ye know on earth, and all ye need to know.

Having a beatific vision of Beauty, Keats surmisingly lays down a pretty song which in its shortness, force and prophetic oratory is certainly a spiritual message from above. The poet soaring to those realms where 'the truthful angel sings' snatches up a fiery idea and has the art to mould his vision of the True and the Beautiful into a verse which in its very width of vision harmonises the two greatest conceptions into one single æsthetic dream. If Beauty is as it certainly is, does it not reveal to the whole mankind the greatest secrets of the universe in both visionary and spiritual aspects? If Truth is Beauty, does it not fire the world to have their eyes open and transfer that ocular vision to the mind?

Another conception of his well-known stanza—

'A thing of beauty is a joy for ever;
Its loveliness increases; it will never
Pass into nothingness but still will keep
A bower quiet for us, and a sleep
Full of sweet dreams, and health, and quiet breathings.'

and sometimes into disaster: or, if it be a very small fragment of the truth, they may be whirled into the idiotic folly of certain eccentric movements in arts and letters.'

Therefore meditation, if it gives birth to truth within the mind, holds more eternal value. Inborn truth is most valid and if it is born out of things that we see, in which we live, it is of immense service to the ethical progress of mankind. Nature if contemplated upon in order to arrive at the central harmony of things, is the best medium, and the poet who sings of Nature the best instructor.

Browning crowns Nature with all beauty when he says—

'O world as God has made it! All is Beauty'.

Let us pause awhile and consider how Beauty crowns Nature. To consider this aspect is to have an æsthetic vision of the good in Nature; and such a vision once lit within the mind's eye opens all the refulgent lights of Heaven.

From Beauty we come to Pleasure—'pleasure such as leaves no sting behind'. It is the power which lessens and illumines the burden of life—it breathes the very essence of the pure and the delightful. To a poet Nature is a pleasure as against a lawyer to whom it is all politics.

'There is a pleasure in the pathless woods,
There is a rapture on the lovely shore,
There is a society when none intrudes
By the deep sea, and Music in its roar'.

(Byron)

Imbibed with the spirit of contemplation Shakespeare speaks of—

'Tongues in trees, books in running brooks,
Sermons in stones, and good in everything'.

'Good in everything'! Are they not sweet angelic words to wash away the evils of human life?

We have not still done away with Beauty.

The conception of Beauty, as spiritual mood emanating from reflection upon Nature, is the highest privilege of Man. Life

elevates our intellectual powers and fills our mind with thoughts at once inspiring and divine—for, says Thompson :

' And meditate the Book
Of Nature, ever open '.

Those who meditated were able to deliver the message of an inspired life. The poet who is the very wing of meditation sings of Nature as Divine—

' The spacious firmament on high,
With all the blue ethereal sky,
And spangled heavens, a shining frame
Their great Original proclaim.'

(Addison)

Here is a light of vision from which the poet is caught up into the glory of the sum of things—

' Nature is but a name for an effect
Whose cause is God.'

(Thompson)

Such lyric utterances are of immense value in the modern world of intellectual obscurantism. We would better quote Alfred Noyes here and present a brief sketch of the chaos that is prevailing in literature in the search for Truth.

' If one were asked to state the fundamentals of all the discords of the modern world, the chaos of thought in politics and religion, the confusion of standards in ethics, and the bewilderment of critical judgment in art and letters, the cause could probably be given in two sentences. Our world is now so highly specialized that it grows more and more difficult for us to relate our particular fragments of the truth to the whole. On every side there is a war in progress—not so much between falsehood and falsehood as between innumerable fragments of the truth; but when undue stress is laid upon a fragment of the truth, whether it be in the theories of psycho-analysis, of post-impressionism, of cubism, of conservatism, of communism, of the value of novelty, of the value of institutions, then men plunge headlong into error

As to the immortality of life we have a happy illustration from Anna L. Barbauld. Being pulled down with such discouraging remarks as Seneca's—' Life is only a journey to Death ', or Cowley's exclamation—' Life is an incurable disease,' we long for a future that is transcendent, happy and eternal, something that would illumine our present course of life and would make us exalt on its happy entrance into immortality in the end. Barbauld inspires us to such a future—

' Life ! we have been long together,
Through pleasant and through cloudy weather ;
'Tis hard to part when friends are dear,
Then steal away, give little warning
Chose thine own time ;
Say not " Good night " ; but in some brighter clime
Bid me " Good morning ".'

Our next step now is from Life's great sea to Nature. Nature was analysed, operated, painted and pictured, but it was seldom contemplated upon. Scientists try to suck the life-blood out of it, Philosophers nurse upon her psychological intricacies, Biologists, Evolutionists, Zoologists and others investigate one of her more solid treasures, but Poets sing of it as a whole. Courageously they call upon men and say—

' Come forth into the light of things,
Let Nature be your teacher '.

It is the greatest privilege of Man to see the body as well as the soul of Nature. But it is a privilege which is very often neglected than enjoyed. We see the anatomy of things, the paint and picture of things but not the soul of things. Soul is the light, the spirit which thrills all organic bodies—nay, even inorganic ones, if the recent scientific researches are to be held in view. Soul is the only Truth, yet how many advocates of Truth are there who endeavour to approach it in all sincerity ? Our flight from matter to the soul opens out the vista of eternity, enlarges our vision and imparts to us supernatural delights. It

Wordsworth presents to us a more gleaming but mystic aspect of life. Says he—

'Our birth is but a sleep and a forgetting;
The soul that rises with us, our life's star,
Hath had elsewhere its setting,
And cometh from afar;
Not in entire forgetfulness,
And not in utter nakedness
But trailing clouds of glory do we come
From God, who is our home'.

We are the 'trailing clouds of glory from God.' O, what an exaltation of man's humble station in life!

'And cradles rock us nearer to the tomb.
Our birth is nothing but our death begun'.

(Young.)

Young's outlook on life as expressed in the above verse is superficial, yet it signifies one of its conspicuous aspects. Make God our home and keep up the glory bestowed upon us from Him and our death will be a happy entrance into Paradise. We live in a world of vast influences and we are the children of time. Our attitudes and our mentalities change with the current thought. With such constant changings of mind and manner, we find human nature shifting from one scene to another, from one aspect of life to another aspect, sometimes lying at a pole's distance from each other. How are we to designate the right path—the happy smooth way towards home. The Greeks and the Romans passed away from the stage, the Arabs and the Parthians played their own parts and now we are in the grand theatre of life. Which of these was the happiest nation, and whose lofty thoughts would lead us right towards our goal? Leave aside the scientists and the philosophers, for they are few. Think of the vast humanity, the innumerable hosts of God's immense creation, and lay down a message for them. Elevate their ambitions, exalt their outlook on life and bring them to the path of virtue and then you will truly serve yourself, your country and your God.

but sparkles near the brim'. It is born of that bitter experience which most men have to face with the harshness of fate. Gray's *Epitaph* is a remarkable piece of the world's grievous ways :—

'Life is a jest, and all things show it;
I thought it once, and now I know it'.

Now turning towards the poets' thoughtful sayings on life we would first begin with a melancholy sage, who has drunk a bitter draught of life's enchanted cup—

'Lo, as the wind is, so is mortal life,
A moan, a sigh, a sob, a storm, a strife'.

(Sir Edwin Arnold.)

'We live in deeds, not years; in thoughts, not breaths. Bailey in a wise twitter presents to us the value of right thinking and true action. All life is made up of thoughts and deeds. If so let us consider what are the thoughts to cherish and what are the ends to accomplish. Solve the problem and you will make history, conquer it and you will conquer God!

Milton the blind and the soul-seeing poet of the Divine has his own message to deliver :

'Nor love thy life nor hate; but what thou liv'st
Live well : how long, or short, permit to Heaven

(Paradise Lost, Bk. XI.)

'And so, from hour to hour we ripe and ripe,
And then from hour to hour we rot and rot :
And thereby hangs a tale'

is a silent version of Shakespeare, and 'men grow better as the world grows old' an optimistic view of Ella W. Wilcox. Shakespeare the 'elder brother of every man' improves upon Wilcox's declaration and with his all-pervading spirit presents the world in both its light and dark aspects. If we ripe and ripe from hour to hour we likewise rot and rot. But does it signify the age of a man or his intellect? Intellect is immortal as it lives in knowledge and culture of the world, but it is likely to rot in its own ripeness. We should therefore follow Wilcox and exalt in saying that we 'grow better as the world grows old'.

truth conveyed in those short phrases. Let youth be a blunder, we cannot mend it; let old age be a regret we cannot help it; but let not manhood be other than a struggle. That is the universal keynote of success in life and the only source of true pleasure.

'Life would be twice or ten times life, if spent with wise and fruitful companions', says Emerson, and that is a noble advice to men of society.

'Life is search after power; and this is an element with which the world is so saturated, that no honest seeking goes unrewarded.'

'Life is good when it is magical, a perfect tuning and consent, and when we do not anatomize it'.

These are the maxims of truth from the same author. Life is immortal. In these three words lie the happiest outlook of man; in it is buried the future of humanity. Pointing to that we have a clever saying of G. Kinket: 'What has once lived is immortal.'

Life is made up of both virtue and vice. Says Shakespeare: 'The web of our life is of a mingled yarn, good and ill together'.

'The true pleasure of life is to live with your inferiors' is a quotation from Thackeray. It points out the spirit of help and sympathy, even love that a man superior in life ought to show towards his inferiors. The author gives us an epitome of a happy domestic and public life that a true citizen should live. He declares it to be all crowned with joy and success.

'The world is a Comedy to those that think, a Tragedy to those who feel'. H. Walpole wrote this beautiful aphorism in one of his letters. I agree to the second part of his saying but I do not think the world is a comedy to those who think. Thinking and feeling are both deep and are related to the sensitive nature of man. Only those who have merely a frivolous outlook of life may take the world as a comedy—those who are senseless to its deeper effects. If one thinks as an optimist he is sure to gain all the relish and enjoyments that the world has; but optimism is a rare part of nature and is very rarely possessed. See Byron's complaint on the frugal nature of life when he remarks that 'life's enchanted cup

genuine thought as a matter of experience, an opinion of facts. Again he is a child of fancy and a wave of emotion. One single flash of fancy, one streak of deep human emotion brings prophetic message on his lips—makes him sing a song of life. Let us then hear his song and share his sentiments if possible.

T. Tusser raises a voice of meditation on the unknown power controlling all humanity.

> 'What better thought than think on God, and daily Him
> to serve?
> What better gift then to the poor ready be to serve?

How to think of God and how to serve Him in life are the basic postulates of religion. Let man think out his own religion, feel the pleasure of serving one Divine Power in all humiliation. Also let him offer gifts to the poor, console the afflicted, and he would feel the universal truth lying behind that simple utterance.

Old age, the messenger of death, brings to man a final ending of all earthly pleasures. His lofty page of life shrinks into nothingness and all the glories of his youth fade before the warning of Death. How is he to console his last breaths, the week airy beats of life. Says Southey—

> ' In the days of my youth I remembered my God,
> And He hath not forgotten my age.'

*The old Man's Comforts*, is a simple poem of his. Yet how unflinchingly he holds the rope of Faith in God in these short lines—how glorious he wins consolation in the face of Death! Descending from God's lofty throne let us now face life the only surrender of man.

To define life is to count the waves of the sea, to expound its theories is to fix the wind's flight. What we could do is to collect its divergent aspects and search for truth. Much has been said on life—didactions, surmises, morals and experiences, and it is up to us to choose our own motto and work it up.

Disraeli gives us a beautiful summary of life. Says he, 'youth is a blunder; manhood is a struggle; old age is a regret.' I do not know how far it will appeal to all humanity, yet there are many among us who would perfectly understand the practical

Poets seldom write theses, make experiments, run the machines, preach on the altars, collect cool philosophy in books or make rhetorical speeches in councils. They only have their 'short swallow flights of song', yet they move, inspire, teach and correct. They put the mysteries of life in a nut-shell, and air them with music. Thus they contribute to thought and make man the child of wisdom.

Often in moments of extreme solitude, I have sought for the unknown power that seemed to penetrate every star in the heavens and every blade of grass on the earth: I longed for God's very presence and was deeply moved with His omnipotence. Cowper poured his sweet ditty into mine ears and raised his seerlike forefinger saying:

'God moves in a mysterious way
His wonders to perform;
He plants his footsteps in the sea
And rides upon the storm.'

Imagine the picture of Him whose footsteps lie in the cleaving waves, and whose chariot sails over the fleeting wind.

Pope in his *Essay on Man* sings of the pious Indian, rude but loving Him who is the sole Power of the Universe—

'Lo, the poor Indian; whose untutored mind
Sees God in clouds, or hears Him in the wind;
His soul proud science never taught to stray.'

Read the last line over. In those pretty words lie buried the deepest satisfaction that man can find in the world. The modern age, an age of science whose praise the ironwheels of the hissing machines sing, is blind to the soul, the eternal electricity of life. Happiness should be central and perfect. It should imbibe eternal satisfaction, and eternal relief, but do Radio and X-Rays, Evolution and Politics bring in such soul-satisfying pleasure?

Poetry is a divine and philosophic opinion of life. It does not expound theories or lay down conclusive decisions. A poet is a flash of life, a page of history. In that page there is not written the whole history of mankind but the experience of a single poet. Therefore we should listen to his message, his

Deep and weighty the mind's mighty waters roll in their own depths, and when the 'breath of heaven' fans their sleeping waves they wake and make the very mountains shake: Poetry is the wind of the mind's sea, it wakes its stormy waters.

To the 'masterminds of old' I owe the greatest pleasure of life. Their immortal sayings tinged with the light of wisdom filled me with wise thoughts. To the ancient bards I owe the most precious gems of intellect, and to poetry the unquestionable delights of heavenly reason.

I have often reflected upon the contributions of great writers to thought and I found that the greatest credit goes to the singers of old. Poets seemed to me the revelations, the benefactors of human pleasure and intellect. Their

'Short swallow flights of song that dip
Their wings in tears, and skim away'

were like the angel awaking Adam in his solitary abode:

'Verse sweetens toil however rude the sound
She feels no biting pang the while she sings:
Nor as she turns the giddy wheel around:
Revolves the sad vicissitudes of things.

(R. Gifford)

To sing, to teach, to inspire and to sanctify was ever the function of a poet. All other arts and sciences do but analyse the fields of thought and seek for Truth partial; Poetry the glorious among all five arts searches for Truth as a whole—nay, explores the entire universe where

'Observe how system runs,
What other planets circle other suns,
What varied being peoples every star'.

And where—

'All are but parts of one stupendous whole,
Whose body nature is and God the soul'.

(Pope)

# POETS' CONTRIBUTIONS TO THOUGHT

POETRY has ever been my food for thought, a source of sanctified pleasure. Like the angel's flight it purified my soul, and like the transparent beams of Venus lent my eye a gleam and a sparkle.

A poem 'round and perfect as a star' often gave me intellectual fields of immortal play. The poet's frenzy rolling in the vast universe, his unsurpassed flight from 'heaven to earth, from earth to heaven' made me move like a comet free in the blue vault of space, nearing every star, catching every boisterous swell of the spheres, and picturing every remote planet by a million lights transformed.

Poetry not only lays down valuable thought but also opens great fields of vision. It is suggestive and inspiring, is at once a mystery and a revelation. Follow a poet through his 'majestic harmonies' and you will feel swell with eternal music: lend an eye to his 'round universal pictures' and you will have a galaxy of imperishable lights before you. You will travel with him into the kingdom of God, converse with angels and drink the nectar of paradise. You will feel the pulse of life, be spared all the pangs and the pleasure that bind humanity, even transcend Death in her unpenetrated gloom. Soaring above all philosophy, science, politics and history you will be the very child of intellect, the playful shepherd boy of wisdom. Truth will be your pole star, the very embodiment of mystery half revealed. Music will fan your breath of life, Pleasure play in your arms, and Emotion crown your soul. You will be a man with God's unfathomed delights raging within you.

Thought is the pulse of mind, a living throb of its life eternal. Provoked by thought, and fired by inspiration, the mind becomes the tool of God's power. It rolls like the deep blue sea, with all the tranquil times and the raging weather sleeping within its arms. Yet it stands in need of a wind strong and fresh from the north.

One little word in this estimate of difficulties by a highly intellectual man with a scholastic training reveals the other side of the question. He speaks of it as a *modest* list, and we know at once what he means by *modest*. This is one of those words of quality which are very readily made to connote their opposites. It means here: You and I will agree that no ordinary person would be likely to take all this trouble to understand poetry, which should appeal to something more than mind stored with mediæval lore. There should be some instantaneous appeal to the spirit; the music, the colouring, the wavelike energy of the verse rolling up endlessly, should stir something within us that is akin, some rhythm of our own, some deep sense of beauty, without which we should never have opened the book. And after all, though Wordsworth is declared to be much more difficult than Browning, we should never demand from his readers a detailed knowledge of the French Revolution, of Mysticism, Logic, and of the geology and hydrography of the Lake District for an understanding and enjoyment of the *Prelude*.

E. E. SPEIGHT.

It has been asserted that 'the works of the great poets have never yet been read by mankind, for only great poets can read them.' And Thoreau goes on to say that our ordinary reading is as superficial as is astrology compared with astronomy.

That there is some truth in this sweeping statement, which seems to place great poets outside mankind, is shown by the continuous attempts through the ages to elucidate the works of great poets for each successive age. Even the simple language of the prophets of old would seem to disclose more meaning as the centuries go by, until some of us in these fortunate latter days know more, as Mr. Wells says, of Greece and Rome than was known in their hey-day. And some go further, like Emerson, who when reading Proclus found that he was exploring nature and fate, and was moved to say: 'It is a greater joy to see the author's author than himself.'

A terse and luminous study of the hardness of a great poet is included in Lionel Johnson's too little-known *Post Liminium*, a treasury of modern criticism. For him 'Dante will always be the hardest poet in the world, not excepting Æschylus, Pindar, Lucretius, Shakespeare, Milton, Browning.' And he goes on to show in what manner the hardness of Dante differs from the allusive difficulty of Pindar and the quality of Hamlet that is in Shakespeare himself. He shows how Dante for most people means a few names, such as 'Francesca, Ugolino, Matilda, Sordello, and a score of lovely descriptive lines,' while the great argument of the poem is beyond the ordinary reader. But this can be overcome, if we are willing to make a close study of mediæval history, thought and science, of the Tuscan language, of Italian art, Archæology and Topography. 'If you know the *Æneid* of Virgil and the *Summa* of Aquinas, so much the better will you know Dante. But it is not too much to say that till you know these and many other things also, you cannot know Dante. No other poet demands so multifarious a knowledge in his reader.'

And he goes on to compare Dante with Michael Angelo, both of them overwhelming in genius rather than conquerors by charm, both lovers of law, the beauty of both one with their thought.

> to him, but came back with a wonder, came back above all with a high and magnificent beauty.'

Coleridge has divided readers into four classes:

1. Sponges, who absorb all they read, and return it nearly in the same state, only a little dirtied.
2. Sandglasses, who retain nothing, and are content to get through a book for the sake of getting through the time.
3. Strainbags, who retain merely the dregs of what they read.
4. Mogul diamonds, equally rare and valuable, who profit by what they read, and enable others to profit by it also.

A little imagination would enable one to extend this classification considerably by making a little more allowance for human difficulties and aspirations. Books *are* bought in enormous numbers, even serious ones, and we must assume some serious aim in their being read; moreover it is certainly true, as Hugo von Hoffmannsthal has impressively pointed out, that:

> 'Everything that is written in a language, and everything, I dare to assert, that is thought in it, derives from the productions of those few who have ever dealt with that language creatively.
>
> All that which in the widest sense we call literature, down to the libretto of an old-fashioned opera and the paper-backed novel, all derives from the few great books of the world.'

For Hoffmannsthal the central gesture of the age is 'a man with a book in his hand, even as the kneeling man with folded hands was the symbol of another age.' And he finds in this universal, incessant habit of reading a sign of an intense spiritual yearning, most people seeking they know not what, but for him a stirring of the emotions by thought, a rousing of deeper, cosmic emotions, 'precisely those which a true and stringent science' must always deny itself and which the poet alone can give.'

# THE READER

IN all our study of literature we must remember that there are two parties involved. All the benefit we get from literature, whether as sheer and mere enjoyment, or as guidance, or as the encouragement our being needs for its fulfilment, depends upon this recognition that there are two parties to the comprehension of anything written, the writer and the reader. Prof. Raleigh somewhere speaks of this colloquy, this dramatic relation, coming into existence even when we read a lyric.

The Book of Job has been called the first great colloquy between man and his Maker. Thus we see into what awful presence we may be called when we open one of the books the world has set on high; and that in the reading of any great literature there may be in our presence, with the writer and the reader, a third, a shadowy watchman of our thoughts.

So the responsibility on the reader is a twofold one: he has not only to do justice to himself but to the author he is reading.

Resource to books has now become so much a matter of second nature that one of our leading scientists has had to point out the danger involved in a state which substitutes books for real life. This danger was hinted at half a century ago by Schopenhauer:

> 'One should only read when the source of original thought fails, which is often enough in the best heads. To scare away one's own original thoughts for the sake of taking a book in the hand is a sin against the Holy Ghost.'

This is of course a counsel of perfection, and it does not take account of the experience of those who read to compose the trouble of their souls, an experience almost lyrically recorded by Henry James:

> 'He began to read and, little by little, in this occupation, was pacified and reassured. Everything came back

'Talked of me!
Or meanly?
How mayst thou reach thy goal?'
I just smiled and turned away.

The limped clay trotted
Trotted along
Behind me
Along my way
To a house of clay
My abode
Sanctuary:
He knocked at the door
And called me out
He was then a furious clod of clay.
'Why shouldst thou follow me thus
To a place not thine,' I asked;
'Disturb a soul not akin to thee?'
He burst into a laughter and turned away.

I stood at my door
And gazed
Gazed at the passing figure,
The limped clay
Seemed to me
Vanishing into the air
With the swiftness of a lightning flash.
I ran out and cried aloud:
Come back, come back, my friend
I shall still have a word with thee.
He heeded me not and went away

That night was a sleepless night
My place of rest was a cell in hell.

Tell me,
When I whispered into Thy soul
The other day,
Did I speak for him
Or for me?

S. A. L.
*Osmania University College.*

# VERSES.

## I.

THE moth rushes at the flame,
And burns,
It knows not why.
There are moths amongst us too
With gifts of brain
Yet rush at the flame
And burn.

Why askst us then
We turn away
From the path of the ordinary clay
Thou sensible friend
The passing sweetness of a decaying day.

Great God !
Do not bind us, the few we are,
To the dark tomb-stone of a dying day,
We have cried within, and never without,
Into the midst of Thy widening Space,
With the stillness of a listless soul,
With the voice of a burning moth,
Where quietude reigns
And where you, too, may live.

Spare us and forgive
Moths we are,
A gentle yet a terrific race!

## II.

When I whispered into Thy soul,
The other day,
A pot of clay,
Spoke to me,
Stealthily,

From the dark background, that suggests the blankness of imagination, emerges a white marble phenomenon,———two lovers, a kiss, an embrace and a tomb. And we see the whole drama staged, in a glance at this masterpiece of sculpture. The Lovers' faces are half-hidden and undistinguishable. For Love is blind, and life is tragic; Juliet's naked shoulders here reproduce all that Shakespeare strove to do in the creation of the beautiful; the embrace, that has been carved with masterly strokes, reveals the immeasurable depth of the passion; and the tomb with its romantic yet dreary aspect, makes the piece a living tragedy.

With the genius of a Shakespeare, with the art of a Michael Angelo, with the conception of a Byron, with the treatment of a Beardsley, comes forth Rodin—one of the greatest artists that this world has ever produced since the golden age of the Greeks.

AZIZ AHMAD,
III YEAR,
*Osmania University College.*

# ROMEO AND JULIET

## A DREAM IN MARBLE

RODIN ! Rodin !! Rodin !!!

'Is it a dream ?' felt my sleeping senses ; but they woke and found before them an impression on paper, of the marble portraiture of 'Romeo and Juliet' by Rodin.

My eyes were fixed ; I watched and watched, still bewildered, still intoxicated, still unsatisfied. I was unconscious. The Art with one of its paralysing strokes had numbed my senses.

A translation it was and what a translation ; the translation of poetry into marble, of conception into style, of imagination into form. Only if Shakespeare could have known that he had a rival of his dreams in another sphere of Art.

Shakespeare and Rodin, the two creators of their own worlds, are here seen together composing a story of Love and Lament.

There comes Shakespeare, the greatest of all bards, and from the Eternal Spring of Love presents a gem, one the best, the noblest and the loveliest of the jewels in the literature of all time.

Four hundred years have passed ; men still admire it, and they are not tired of admiring.

Then comes——guess who ? Another dreamer, a dreamer in marble,——it is Rodin, the Michael Angelo of our century. With his sane, masculine conception he reveals in marble the beauty that lay buried in the dead poet's heart, and only a part of it he could express in his immortal play.

'Our sweetest songs are those' dreams Shelley 'that tell of saddest thought.' And *Romeo and Juliet* is one of the saddest thoughts that inspired sweetest songs. But now just imagine these heavenly songs and their spiritual harmony assuming shape.

# TMU

Of all the Kings of Egypt,
Of all their ancient dead,
The mummies and the corpses
Like leather or brown bread,
(Of goddesses and ladies
Just now I do not sing,
They are, to put it courteously,
Quite another thing)
Of all their myriad men-folk,
Whose figures we have seen,
There's only one I wish to meet,
Corporeally, I mean;
One of whom is written,
Mysterious, yet so clear,
Words I have never seen elsewhere
Yet all one needs to hear:
*I have come to earth, and taken*
*Possession with my two*
*Feet* (Then comes a silence . . . .
And lastly:) I am TMU.

E. E. SPEIGHT.

Into the land of living light
They're calling me, O mother of mine,
And I must go; little mother, good-night,
A blessing on you, mother of mine,
A thousand, thousand blessings rest
On your brave heart, your heart so true ;
They're calling me, calling me out of my nest
Over the waters away from you,
Into the great world of the sun.'
He laid his head to her shoulder's ease
And gave one sigh, and he was gone
With the darling swallows over the seas.
And as night fell there rose the cry
Of a woman keening with no one by,
Lonely in that desolate place :
God's pity on her anguished face.

## THE EAGLE

When I climbed the savage mountain
To watch an eagle in flight
I lost my way and there must stay
Wan guest of the drear night.

And the hours turned to years
In that fog-bound bivouac
With nothing nightlong to behold
But the hosting of the wrack.

But a mighty revelation
Was mine when night was done,
As I rose to greet the ascension
Of that eagle heart, the Sun.

# EVENING IN IRELAND

THEY led him out. He spoke no word.
But in his heart this memory,
As he faced the firing squad unstirred,
Moved like an evening litany.
The swallows were flying in a flock
Into the southern world, and they
Were watching from a ferny rock
The dear birds as they flew away.
And as the dark wings crossed the wood
One pair returned, whose nest had been
Above their window, and whose brood,
Reared in safety, they had seen
Piping and peeping, growing fast
Through the earth's waking, till at last
From the cosy nest they all arise
And float along the sunbeam forth
Into the noontide. Happy pair
Bidding farewell to the trusty north
And the heralds of winter there.

Down they swoop to the little boy ;
Over they turn, and close to ground
Sweep along in swiftest joy,
Rising with a passionate bound
To brush his cheek, then off again
With a wistful note of pain,
Off into the fading flock
Far beyond the ferny rock.
' Mother, they're calling me : he cried ;
' Come with us over the lifting sea
And round the mountains far and wide
Into the South so far and free ;

# WHAT IS WRONG WITH THE WORLD

THE wrong with the world now is owing to the increase in human knowledge. The world is the same as it was a thousand years or a million years ago, but we, the workers of the world, are making it good or bad. Though knowledge is not a pernicious thing in itself, yet it is a cause of much unexpected development and tension. The increasing sense of individual authority and of nationality combined with economic competition are the chief causes of the unpeaceful state of the modern world. We find everywhere rebellion, opposition, resistance and revolution throughout the globe. What is the cause of all these things? I think it is the result of the production of a zeal which made the commonalty stranger. Lack of equality gives rise to all the troubles. Unequal distribution of wealth is the cause of all the present unstable condition of the world. Political consciousness is causing great havoc now-a-days. Life requires the complete fulfilment of our wants and a happy and joyful career. I think our ancestors were more happy and lived a merrier life than we are living now, and that was owing to their simplicity, pure-heartedness, unity and the love for the members of their community.

MD. FARID-UD-DIN KHAN,
IV YEAR,
*Osmania University College.*

# THE HOTELS OF HYDERABAD

THOUGH, now-a-days there are many up-to-date and decent hotels in Hyderabad, I will lay emphasis only upon the old-fashioned and dirty hotels, for it will be more interesting, and it will concentrate our attention more.

When we go to this kind of hotel, we see in it a crowd of people, some chatting, some laughing, some singing and all of them doing whatever they like. Generally to these hotels go people who do not find amusement, or rather such cheap amusement elsewhere. Here they come and order a cup of tea, and a pan-ka-bida. Drink tea, eat the pan, and then settle there down for at least a couple of hours.

During this time innumerable subjects, political, theological, scientific, philosophical, historical, and others are come in discussion.

Some one says: 'I heard that the British Government has given back Berar to our Aalahazarath (the Nizam). Then another replies: 'O! yes, the other day I have seen it in the newspaper.' Then a third man emphasises the argument by saying: 'You people are saying things which are only given in the newspapers, or which are talked about by people, but I say that only a few days ago when I was "MYSELF" in Berar, I have seen with my eyes that Berar has come into our Sarkar's (the Nizam's) possession.' Now the problem is solved and acknowledged that Berar is in the Nizam's possession.

After that some other man says: 'I will tell you a more wonderful thing, and that is, our Government is going to make a cover of a rich cloth for the Charminar in order that such a grand building may not be injured by rain and sunlight. How liberal our Government is'! Then all of them begin to praise the Government for such a wonderful deed. And also go on saying: 'What a fortunate and bold man our Pasha (the Nizam) is that he got by force Berar into his possession again, even though the British Government is far superior in power'!

MD. ABDUL GHANI,
IV YEAR,
*Osmania University College.*

# THE TREATMENT OF BEGGARS

THERE are many kinds of people in this world whose claims we ought to recognize, and among them are beggars, relatives, neighbours and friends.

Now each of them has a claim over us in proportion to his need. Beggars are the most pitiable persons, and therefore they need our help and sympathy the most. But it is a pity that in the present age beggars are looked down upon with the utmost contempt. They are humiliated in a manner that does not become a human being, the noblest creation of God.

Every religion enjoins upon its followers to be ever helping beggars and fulfilling their requirements. In one of the chapters of the Holy Quran also it is said 'Do not reject a questioner (beggar) even if he comes to your door, riding on a horse and ask of you something to eat.' In another place it is said 'Ye shall never attain unto righteousness, until he give in alms (to beggars) of that which he love (the most) and whatever ye give God knoweth it.'

This is the difference between how we should treat beggars and how we are really treating them.

ASGHAR ALI,
II YEAR,
*Osmania University College.*

# SOME CLASS EXERCISES

## AN INDIAN BIRD

EVERY country in the world is famous for some sort of bird or animal. For instance, Africa is famous for its lions, England for its pheasants, the Polar regions for their white bears, America for its jaguar (a kind of a leopard), Australia for its kangaroos, Arabia for its camels, Japan for its hawks and India is famous for its peacock.

It is one of the species of pheasants, and they call it the Indian pheasant. It is supposed to be the most beautiful of the game birds. Nobody would hesitate in saying that there is no prettier pheasant than the peacock. Its shiny green coat with blue spots is simply marvellous and shows off beautifully in the sunlight.

We should be proud to say, that our India, which is far behind other countries, can at least produce a bird which is far superior to any of its kind in the world.

The pea-hen is not so beautiful as the cock. It is an ordinary bird with a muddy brown colour. It does not dance as the cock does and has a very short tail.

The chief beauty of a peacock is when he is dancing. All of a sudden you will see him shake his feathers, and up goes his tail like a fan, and then he walks about, doing different steps, which have no regular rule like a fox trot or waltz.

M. M. ZAHIRUDDIN KHAN,
II YEAR,
*Osmania University College.*

it left no house in Maharashtra without mourning. Unimaginable calamities followed. Hopes of prosperity were but as dreams and what was bygone was bygone. Marathas received this news with the woeful screams of widows and despairing cries of mothers. It was a horrible and frightful phase through which the country was passing. Viswas Rao, the pride of the army and the boast of his country was no more on the battlefield. The disorder was chaotic. Flying to asylum appeared to be the aim of the soldiers. From the battlefield Khandu, with wounds upon his body, went to a neighbouring village, seeking a nursing hand in peril. Luck favoured him by leading him under the kind roof of an old woman, Roshanbi. Accidentally they were brought together but the treatment he received was motherly. In his dreams and drowsings the sweet remembrance of his wife came to his mind.

Days passed by without any kind of message to reconcile the heart of Ganga. She was utterly unaware of the safety of Khandu. She cried and cried at rest or at work. Without Khandu their home was a desert to her. Nobody ever knew what had happened to Khandu. But she saw him reaping and singing, not in the body but in the spirit. One day as she was cutting the corn the scythe wounded her finger in her forgetfulness. Tears came to her eyes as she thought that she was a prey to perils. But she did not know that it was a lull before a storm. A horseman came galloping near her and recognized her. Eyes saw eyes and heart knew heart. Jumping down from his horse he embraced her and begged her to forgive him ; and what he said to her meant exactly the same as when the poet sang—

I could not love thee, dear, so much
Loved I not honour more.

JANKIRAM PANT AHERWADKER,
B.A., LL.B. (Previous),
*Osmania University College.*

Poverty was a blessing for them because the significance of Life as Labour was known to them. They did what was right and abused no one, and this was but the purity of their hearts.

Those were the days of chivalry and those were the days of glory. Bloodshed and warfare were the order of the day and lawlessness and wretchedness rife. The Maratha power was at its zenith and the Mughal power at its end. The once grand and pompous Mughal suzerainty of India seemed to be passing into the hands of titular Marathas. The flag which first flew in the Western Ghats was now flying in the vicinity of the Himalayas. Yet it did not know that it was but vain boast. Ruin was hidden in the womb of the future. Viswas Rao was ambitious to seize the throne of Delhi. At last the battlefield of Panipat decided the fate of both parties. The drums were beating in the village, calling them to war. The whole country was roused to action. The people thought it their duty to enjoy life in the time of peace and to make every sacrifice in the hour of trial. One and all who were capable, made themselves ready to make use of the best opportunity. Khandu was not an exception to the rule. Ganga's love was a great obstacle in his way but he valued duty more than love. In love he was faithful but in duty he was most enthusiastic. Separation from Ganga was of course a heart-breaking trial but he was to undergo it also. The day came when they were to leave each other. Khandu parted from his wife with an embrace and tears in his eyes. But accidently a sign was made on his coat by the red mark of her head, and it became for him an object of reverence. It brought back the memory of those golden hours which he spent in the company of his beloved. The pangs were very severe but he started with fresh hopes and new assurance to make his name sound with glory in the annals of Hindustan. The whole Maratha country knew how to worship honour, and so joined in the national sacrifice.

The battle of Panipat proved disastrous to the Marathas. It was the turning-point of a movement which was to bring them to dust. The Maratha supremacy was at last threatened. Before the battle there was no power to rival them, but nothing was certain after the battle. So disastrous was this defeat that

# THE BOAST OF CHIVALRY

THE day's labour was nearly finished. Khandu with a grass bundle upon his head was stepping through the field ways. His steady pace indicated the benignity of his mind. It seemed from his appearance that he was as noble as he was sincere. But the sweet murmuring noise with the consolation of his wife gave the place a distinct significance. Yet he was tired and threw the bundle down upon the river-sand.

The shadows of evening were falling. The village was a hive of crowded people. Some came from the fields and some were lingering behind. Cattle returned to their sheds and some were bellowing for a sight of their young ones. The lulling sounds of the bells gave pleasure to the passers-by. The small and ruinous temple attracted men and women for the evening worship. Glittering lamps covered by saris were carried to the temple by women to keep burning inside. Some of the busy housewives seemed to be taking round the *tulsi* plant and some children were calling lovingly to their sires who were late in returning. Ganga and Khandu came home and both were absorbed in their usual work.

They were residents of the same village. It was rumoured that they were the most happy couple of the village. Their marriage had taken place a few years ago. But unfortunately they had no child. This did not diminish the pleasure of the married life. They were as happy as they were contented with their lot. Was this not the key to happy life? This and this only was the way of their happiness!

Khandu was stout and strong as Ganga was fair and robust. He was a soldier by birth but a cultivator by profession, and she was a woman by birth and wife by profession. In the field of chivalry he was unsurpassed and in the field of romance she was unrivalled. They were thus what they ought to be. People of the village knew them and sang the praises of their happiness.

# THE INDIAN CUCKOO

[*Koel*]

O JOYOUS messenger of Spring! To us
Thy little life is as a fountain of joy;
Thy beauty and thy music's harmony
Please all who hear and see.
Thy melody, thou enchantress, is divine,
Whose like we never heard from any mouth
Of mortal bird! Thou bringest hours of glee,
Enraptured days and murmurs of delight.
No sooner do I hear thy voice than I
Become uneasy, filled with eagerness
To glimpse thy face: I hasten out of doors.
Where art thou? I have wandered here and there,
Through wood and garden, taking every path
That might reveal thy presence.
But ever thou eludest me, conveying
From place to place thy message of high mirth.
Yet thine ownself knows naught of this good cheer;
Why art thou sad? What means this constant mourning?
O precious one, wilt thou not tell to me
The secret of thy sorrow and thy pathos?
I, too, know pain at heart; for thou, O cuckoo,
Art but a prisoner in the pitiless hands
Of the Goddess of Shadowy Grief.

SYED MOHAMMAD MOHSIN, B.A.

the plant and animal life in Africa and by means of such films the world may be seen on our screens. But such films are very rare, because it is difficult and costly to produce them and also because they do not afford 'amusement and pleasure' as much as do others. Films are now used for purposes of imparting education. But that is confined to those institutions whose business it is to do so. Were the productions of films entrusted in the hands of literary and educating institutions, they will do much good. There is still much to learn even in these films, if only one wants to learn it. But it is amusement we require. Well, one has to attend every film and show.

V. R. CHARI,
I YEAR,
*Osmania University College.*

have begun to like bowers, groves, and secluded places to go on with their courtings. They have thrown off the shackles of society and there should be 'freedom' in everything. *The Nurse*, an Imperial production, is the most immoral of the films and the *Girl-mad* turns the head of the youth. They say there is no sin in the worst of 'social evils'. Smoking, drinking, dancing and free indulgence in other kinds of immoral and wealthy pleasures are widespread. On our tables are to be seen glasses, and cigarettes, and lovely photographs of actors in several moods and dresses. Every one decorates and furnishes his room according to the latest 'fashion', so much so that their tastes and pleasures and their notions of these have undergone a thorough revolution.

The young sister of the cinema is photography including cinematography. Photographing their kith and kin and their friends, their pets and kids in several different moods and modes has become an 'Art', and a hobby. The rich have cinematography by means of which they keep 'living records of things.' They have their own home-cinemas. These are the tastes, hobbies that have made men recklessly extravagant, and careless, and hollow.

In India the film production has not reached the scientific perfection as in the West. Managing the shows with rotten and old machines and films in the unhealthy and ill-ventilated theatres have spoiled the health of the society. The atmosphere there is full of smoke; the glare on the screen and the quickness of the motions weaken the eyesight and cause heavy strain to the eyes and nerves.

On the whole it has driven virtue, simplicity and health out of society and brought in vice, show and ill-health. The cinema is thus doing more harm than the romantic and ill-printed and cheap fiction of least literary value that is produced by money-making authors and meant for pleasant reading. It may be admitted that there are several good productions that are valuable sources of knowledge: historical films which can do much good by depicting the lives of great men. I have seen *The Napoleon*, an American production which left a deep impression upon my mind; there was another film *Hunting in Africa* that represented

# EFFECT OF THE CINEMA ON SOCIAL LIFE IN INDIA

THE Cinema is the most striking feature of this century. Some genius invented these movie-pictures and Mammon caught hold of them and adopted them for his purpose. At present the greatest film productions are in the hands of rich companies and the object of these companies is really to make money. Therefore they strive to make them popular not in the sense of producing such films that would be morally good but to draw large numbers to the shows.

To make them popular they produce plays that are attractive. Even our handbills that are distributed we can see '*Romance*', '*Thrill and adventure*', '*Makes one's blood boil*'. This tells clearly the tale and therefore the film-companies give occupation to those composers, producers, photographers and actors that can accomplish these ends.

It has become the fashion in these days regularly to attend shows. It is the most popular amusement, and cheap one also. The social films are the best advertisers of fashion! I have actually seen boys and girls adopting the latest fashion of wearing the hair as the cinema stars do and wearing the latest forms of dress. It has gone so far as that there is fashion in walking, laughing, talking and, in short, in every movement of a person. Some say 'look at his ugly dressing and snuff voice' (talkies have done this): 'Oh! wanting in manners.' 'He doesn't appear to be used to a reformed society.' 'He ought to have lived in the last century': such things are but common-place. It has brought elegance, design, delicacy and sweetness into the society. It has made us all butterflies.

These 'Love-films' wreak the moral of the society. The majority of the films are such. They have turned the young generation into a set of flirts. Dancing and balls have become very popular. These add to the pleasure the cinema gives. Men

till I have seen every tree and every flower of my garden. Wherever I go I hear the voice of Ram Din. The wind blows and draws his voice from the leaves. The flowers laugh but in them I see the form since of Ram Din. The birds are singing, but their song is like that which once I used to hear from the hut of Ram Din. It makes me lick with longing, and I say to myself :—

' Ram Din, what is the matter with you? How do you gain supremacy over nature? You were a gardener. Perhaps the dumb creatures of the garden have told you the secret of eternal life. That is why you are everywhere.'

HASAN ASGHAR,
IV YEAR,
*Osmania University College.*

# RAM DIN: A STORY.

(*This story was published in Urdu in the* Hamjoli *of July 1930.*)

(1)

RAM DIN is my gardener. People say he is dead. But no, he is alive. How can I believe. When I hear him, when I see him, when my heart feels his presence.

(2)

At sunset when I sit by the side of the cistern in my garden I see some supernatural creatures flying round and round the fountain, till they diminish, till they mingle in drops of fountain spray. They are like Ram Din. It strikes me. I at once ask: Oh Ram Din, what is the matter? How the force of the fountain increases; How full the cistern is! A voice is heard—a very calm voice as if coming from some other world.

'It is the life of the fountain to keep the cistern full so that the plants may not wither—the Beauty of garden may not decline and its flowers, may scent the mind of those who pass through it; that the bees may come and get the honey from the garden.'

The voice disappears and I take my way to my bungalow. The full moon is scattering its splendour on my garden. It attracts on me and I throw myself on to the ground. I begin to see the moon. Now I am in some other world. I see some creatures flying round and round the moon. They are trying to cover the moon with their little wings. It seems as if they are trying to turn the whole light of the moon in my garden. I see them again and again. I recognise them. They are like Ram Din: What are you doing? A voice comes from heaven.

'In my life time, it was my ambition to snatch the moon from the sky and put it in my garden so that my whole garden may possess an everlasting light. The people of the world should have light in dark nights in my garden.'

(3)

It is my habit, that I get up early in the morning and come out from my house to take a walk in the garden. My heart is never satisfied till I walk on every lawn path,

has put its seal on a Federal Constitution for India. It has also gone to the extent of making federation a necessary pre-condition to the granting of further reforms to British India. On the whole the states really stand to gain by joining the federation. They can now take advantage of the situation and get certain financial wrongs adjusted. Secondly, by coming into closer contact with British India they are sure to improve themselves in an all-round way by, for the first time, breaking the wall of isolation behind which they have been getting on all these days. The rulers of the states are really afraid that this contact may infuse into their people ideas of popular government which may endanger their stability and prestige. But the princes may know that the feelings of the people cannot be suppressed for ever. It is therefore better for them to concede to the people what they seek for as an act of grace long before it will be snatched from them by compulsion. That has been the lesson of history. It is un-understandable how the princes stand to lose in a responsible government. True, they then cannot hope to give full and free exercise to their whims and fancies but they must know that they will then be the ideals of people loved and respected not for any favours expected or out of fear, but because the people feel that there is no dividing gulf between themselves and their ruler.

MIR MAKHDOOM ALI KHAN,

IV YEAR,

*Osmania University College.*

to even the least advanced provinces. They are being governed by an out-of-date kind of despotism and are very particular about guarding their ancient rights guaranteed by treaties with the East India Company and sanctioned by traditions. The existence of such political units adds a complexity to Indian federalism unknown to any other federal constitution in the world.

The Government of India themselves from the beginning had no definite ideas about the nature of the future constitution. They were treating the provinces always as if they were subordinate to themselves. They never prepared them to be independent states ready to join a federation. The Montague-Chelmsford reforms by establishing dyarchy gave to the provinces a certain amount of responsible government which is now known to be a sham. So that if the provinces join the All-India Federation they do it not as pre-existing independent states but as units which expect the new order of things to get that which they had not before, i.e., provincial autonomy. In no other federal constitution did such a thing take place since in all those cases the federating units had an independent existence. In the case of the Indian provinces they stand to gain now since they got what they want and they can effectively prevent the Central Government from taxing the provincial people for central financial purposes.

The Indian states present a peculiar problem. For one thing some of them are at present more independent than the provinces and therefore are better fitted to join the federation. But in point of political and other kind of progress they fall behind the provinces. They have also certain treaty rights with the British Crown, as they say, which they do not like to part with or transfer to the Indian Government. They also want that there should be certain financial adjustments in matters of revenue from customs, income-tax, salt, and railways etc. Thus the federating units have divergent objects to attain and are also on different levels of progress. On the top of all this, the smaller states which are innumerable but which are zealous of their rights, perhaps even more than the bigger states, fear that in an All-India Federation they will be swamped out of existence.

In spite of all these difficulties the Round Table Conference

union. Here unlike in a confederation membership when once entered into cannot be easily withdrawn. The constituent states at the time of becoming members of a federal union agree to part with certain powers which they were exercising before. These powers generally concern common matters of state in which for national interests uniformity should obtain like customs, commercial policy, railways, and currency etc. In these matters the federal government is to be supreme and unquestioned master, that is why all federal constitutions are written and rigid and the supreme federal court is always given the right to interpret constitutional laws and adjudicate in any constitutional points at issue between the federal Government and the constituent-states. Federation therefore offers an easy way out of the constitutional complexities that are likely to arise on account of the emergence of the country-state into modern politics. It saves and guards the sovereign rights of the part states and at the same time gives scope for the formation of a strong state with unified national policies in all-important departments of government.

It is now settled that India should have a federal type of constitution. Indeed this is a country where such a system of political arrangement alone can work. The country is so vast that it is often called a sub-continent. From this also arise other peculiarities like difference in climate, national character and culture. It is also a land where it is impossible to have a common medium of communication unless one is super-imposed. Thus federalism offers to us to bring out with the greatest effect the unity in diversity so that the latter does not act as a drag on the national aspirations of the people. It is also to be noted that in India as at present existing, there are the provincial governments and the Native states. The provinces are more advanced in the art of self-government. They are anxious that now they should get the fullest form of self-government and should be the equal and respective members of a Federal India. Some of the Native states are in point of political status more self-contained and independent as compared to the provinces. But in point of representative institutions and general advancement of the people's culture they cannot stand comparison, most of them, at any rate,

# FEDERAL INDIA

FEDERATION is a system of state building and constitution making which came into existence recently in politics on account of the emergence of what may be called the country-state as opposed to the city-state of old. The ancient city-states of Greece were so small in extent and homogeneous in culture that a unitary type of constitution and direct democracy were possible. On rare occasions when their very existence was threatened the city-states of Greece used to form themselves into a confederation. A confederation thus is the coming together temporarily and for fixed purposes of a number of pre-existing independent states. It follows from this that there was no implicit or explicit obligation on the part of each state always to be a member of a confederation. It could withdraw whenever it liked.

In course of time the size of states began to grow. The development of the idea of nationality has made the state and its area co-equal with the extensiveness of the nation itself. Thus after the age of absolutism there grew up big nation states like Spain, France and Italy. However, after the American War of Independence a new complexity arose. The colonisation of America meant the occupation of a big area which on account of its very size stood in the way of a unitary type of government.

To this was added the other complexity that each state in the American republic represented a particular type of culture and religious belief. For some time these states in America continued as independent units but when they wanted to unite into a bigger whole they found that the size of the company and cultural differences as between two states stood in the way of an unitary type of constitution. It was to solve this that the American constitutionalists brought into existence a federal type of constitution which obtains in all the components of the British Empire.

A federation is thus a type of constitution where certain pre-existing sovereign-states are brought together into a permanent

pronounced in Shelley's poems. What Shelley describes is not a spiritual experience but the pursuit of the unattainable and ideal beauty or love. It is only a mystic that could wish 'the fierce spirit' of the West Wind to be his spirit and say, 'Be thou me, impetuous one' and could cry, as in the *Ode to a Skylark*:

'Teach us, sprite or bird
What sweet thoughts are thine;
I have never heard
Praise of love or wine
That panted forth a flood of rapture so divine.'

In his famous elegy *Adonais*, though the consolation he seeks is not spiritual or ıeligious as it is in Tennyson's *In Memoriam*, he undoubtedly shows himself to be a mystic when he cries out fervently

'The One remains, the many change and pass;
Heaven's light for ever shines, Earth's shadows fly;
Life, like a dome of many-coloured glass,
Stains the white radiance of Eternity
Until Death tramples it to fragments.'

It is this element of mysticism that produces a sort of indescribable spiritual charm though it shrouds the poem in the mist of vagueness. Hence it is when we read Shelley's poems we are often charmed by words which we understand not, inspired by ideas too subtle to be grasped. It is this elusive quality of Shelley's works that makes Matthew Arnold dissatisfied with Shelley, for he wants a high seriousness and sustaining force in poetry. But the want of these qualities in Shelley is more than made up for by his genius which can be summed up in the three words—Lyricism, Idealism or Etherealism, and Mysticism.

P. V. SUBBARAO, M.A., L.T.

condition, and then to sing the glory of the regenerated world. The permanent qualities of this unique drama, which reveal Shelley's genius, are the wonderful descriptions of nature it abounds in, and the idealisation of every one of these pictures. In the opening of the 2nd Act, where Asia describes the dawn, the variegated hues and shades of light, colour and darkness are depicted with a genius which is all Shelley's own. His etherealism or idealism imparts a peculiar charm and an unearthly tint to them unlike the descriptions of Keats who is ever content with and confined to earth. In the inimitable style of a critic it is Shelley 'pinnacled dim in the intense inane' that constitutes the greatest charm of his poetry.

The two extraordinary qualities of Shelley we have noted above, his sublime lyricism and lofty idealism lead to another aspect of his genius, namely his mysticism. There is no word in the English language which is more often misunderstood than the word 'mysticism.' Strictly speaking it denotes a belief in the reality of some spiritual experience in which the experiencer is conscious of the immediate presence of God and a direct communion with and absorption in Him. The experiencer may, at other times, be conscious of some spiritual ideal, which to him is as real as God and with which he wants to become one. The mystic experience is therefore untranslatable, inexpressible and incommunicable. Shelley is one of the very few English poets who are mystical in this sense of the term. This mysticism is more characteristic of the poets of the East than of the West. It is this feature which fascinates Shelley most to the Eastern mind and it is no wonder if it is found that Shelley has a greater number of admirers in the East than in the West. The element of mysticism pervades all the greatest works of the East like the *Ramayana* and the *Bhagavatam* when the poet is in a mood of spiritual exaltation which makes him one with God and the verses, which are the outcome of that spiritual communion, have an inexpressible charm about them. The mystical experience will have necessarily an atmosphere of vagueness and elusiveness about it. For the experience to be clearly grasped the reader must put himself in the place of the poet. Hence mystics say that 'to know is to become.' This element of mysticism is most

over the universe to quicken a new birth like withered leaves.' He concludes the poem addressing the fierce spirit of the West Wind:

> ' Be through my lips to the unawakened earth
> The trumpet of a prophecy! O Wind,
> If Winter comes, can Spring be far behind?'

His longer poems such as *The Revolt of Islam* and *Prometheus Unbound* are lyrical in tone. They are the embodiments of his idealism, his thirst for perfection, and his philosophy of life. As a critic beautifully remarks, in his longer poems there is 'a kind of elusive, yet, rapturous emanation of hope devoid of specific content.' To show that Shelley's genius is essentially lyrical, the most outstanding of his longer poems *Prometheus Unbound* may be considered. Though Shelley calls his composition *Prometheus Unbound* a drama, it cannot be considered one such in the strict sense of the term. It is not a drama, and moreover the genius of Shelley lies more in the direction of the lyric than of the drama. Rightly has it been called a 'Lyrical Drama.' It is not the psychological analysis of the characters, the delineation of human passions, the clash of character and character, or character and circumstance and the evolution of the plot that interest us, but the fantastic creations of Shelley's fancy, his philosophy of life instinct with the breath of poetry and his idealism. The theme of the drama is vague and amorphous, dealing, as it does, with the passions of gods and demigods and it attuned itself to the abstract and metaphysical imagination of Shelley. But it is thoroughly unsuited to dramatic treatment. There is no organic growth of plot, no cause and effect. The central event of the drama, namely the fall of Jupiter, is brought about miraculously. The characters, superhuman as they are, do not evoke human interest. They are only the symbolical expressions of his own theories. The torture of the Titan is the only part of the play which evokes real human interest. The glades and glens through which we travel, the voices of the spirits and the songs of the satyrs we hear, the 'mystic darkness' we see—all these make the poem absurd as drama. But Shelley's idea is not to write a drama, as Shakespeare did, but to express the sense of the evil condition of the universe, a sudden and mysterious change in that

emotions. He is carried off his feet by his feelings and is filled with a divine madness. His lyrical genius appears at its very best in his Nature Lyrics such as *The Cloud*, *The Skylark* and the *Ode to the West Wind*. The most ethereal of poets, Shelley loves to write of heavens, of light and flowers. He does not illustrate the spiritual by the material, as poets often do, but makes Nature ghostly. He sees behind the cloud and rain a spirit. He writes a hymn to the Spirit of Nature. The skylark is to him a 'blithe spirit.' The stanzas wherein Shelley successively compares it to 'a poet hidden in the light of thought,' to 'a high-born maiden in a palace tower, soothing her love-laden soul in secret hour,' to 'a glow-worm golden in a dell of dew' and to 'a rose embowered in its own green leaves,' stand among the highest imagery of poetic art. We meet with the same feeling of disillusionment as is found in his other lyrics, bursting from the depths of his heart when he cries,

'We look before and after,
And pine for what is not;
Our sincerest laughter
With some pain is fraught;
Our sweetest songs are those
that tell of saddest thought.'

Shelley's *Ode to a Skylark* remains unsurpassed among English lyrics for the liquidity and melody of its diction, the enchanting music of its verse, the exquisiteness of its glowing imagery and lastly for its indefinable lyrical charm. The poem defies analysis. It has to be read and enjoyed. A strain of pure poetry runs through it. It is remarkable to note that Shelley, in this short poem of 105 lines, fulfils the loftiest functions he has assigned to a poet and this single piece is enough to assure him a place of permanence in English Literature, should all his other poems perish. While the imagination of Shelley is at its white heat and untrammelled in the *Ode to a Skylark*, it is passive and restrained in his *Ode to the West Wind*. No doubt here also the mood of melancholy appears but the song ends in an unusually hopeful strain. Shelley feels animated by a divine mission and asks the West Wind to make him its 'lyre' and 'drive his dead thoughts

it, ' redeems from decay the visitations of the divinity in man.' It turns all things to loveliness; it exalts the beauty of that which is most beautiful and adds beauty to that which is most deformed. It reconciles all irreconcilable things such as exultation and horror, grief and pleasure, eternity and change. In short, Poetry transmutes all that it touches. Thus his conception of Poetry as a process of idealization is the loftiest in English Literature.

In considering the genius of Shelley it has to be noted that he is essentially a lyric poet. If the function of lyrical poetry is not merely to express one's own emotions and feelings on the surface, but to reveal, in pure terms of art, the hopes, joys, sorrows and the delirium of the inner life of man, Shelley is, doubtless, the greatest of English lyric poets. Before analysing his lyrical genius it may be noted that he was an idealist of idealists. The two absorbing ideals that animated his life were passion for freedom or regeneration of the world, and the passion for ideal beauty. His ideals are vague as all ideals are. All his poems, whether long or short, ring with one or other of these ideals. The success he attains in his shorter poems is remarkable. The vagueness and the unrealisable nature of his ideals of freedom and love produce a despondency and a bitterness of disillusion in Shelley. This dejection, this disappointment of the idealist fills his poetry with a strain of phantasy and a visionary dream-like quality. This mood of dejection is most clearly expressed in his poem *Dejection near Naples.* Nature is to him not a source of peace and comfort, as it is to Wordsworth. The bright skies and the blue skyey isles bring to him

' Nor peace within nor calm around,
Nor that content, surpassing wealth,
The sage in meditation found.'

The same note is struck in his other lyrics. Elsewhere the moon is represented to be a lady 'sick and pale' and as moaning 'for the world's wrong.' In the realm of love also Shelley is embittered with a disappointment which it brings to him. His prayer is ' Send the stars light, but not love to me.' Lyric poetry is the expression of the intense emotions of the poet and Shelley's muse is always under the stress and sway of his

# THE GENIUS OF SHELLEY.

TO a poet and critic like Matthew Arnold for whom ' Romanticism is disease and Classicism is health' and who is obsessed with his conception of Poetry as the Criticism of Life, Shelley is a ' beautiful and ineffectual angel beating within the void his luminous wings in vain.' But what Matthew Arnold considers his defect is the very essence of his genius. He is one of the very greatest of the lyric poets of England, the most ethereal of poets.

Before studying the aspects of his genius we shall do well to consider his conception of Poetry. His *Defence of Poesy* is a remarkable treatise on Poetry, embodying, as it does, his conceptions of Poetry and Poets. He believes, along with others, that Poetry is the expression of the imagination. He assigns to the poet the loftiest ideal and the loftiest work. A poet, he says, participates in the Eternal, the Infinite and the One. A poem is the very image of life expressed in its eternal truth. Poetry, according to Shelley, is not mere composition. On the other hand, when composition begins, inspiration declines. Poetry is the record of the best and happiest moments of the happiest and best minds. His conception of Poetry is essentially mystic. The difference between a poet and an ordinary person, according to Shelley, lies in the fact that the former, being a spirit of the most refined organisation, is susceptible, while the latter is not, to those ' evanescent visitations of thought and feeling which arise unforeseen and depart unbidden but elevating and delightful beyond expression.' Such experiences, says Shelley, produce a state of mind in the person which is at war with every base desire, and it is with such experiences that the emotions of love, patriotism and friendship and the enthusiasm of virtue are essentially linked. Under the influence of such experiences and emotions, self appears as what it is, an atom in a universe. He assigns to the poet the noblest and sublimest function of making immortal all that is best and most beautiful in the world. Poetry, as Shelley would have

Of Thy secret Power with gem-like flowers crowned !
Oh ! how the emerald shades of dense foliage, the dark chambers
Of Sanctity glow with coloured orbs of light
They call fruits. Lo, the waving tops of jewelled trees,
The golden arches, the enamelled halls, the emerald parks !

M. A. QAYYUM KHAN, M.A.,
*Research Scholar.*

# ADAM ON HIS FIRST AWAKENING AFTER HIS CREATION.

(*In Miltonic form*)

I AM thy mystic creation my Lord Divine,
Thine Holy Art has fashioned my frame
Such strange design. Thy breath has lent me power
To think and speak unspeakable words—
Thoughts that are the inspiring angels of a world
Invisible. Feel I within my bosom fair,
And rolling in my head a world of wonder.
What art thou, O thou white lumination
That blushest the cheek of morn?—thou silver gray
That enlights the widest halls of Space? Behold ye Angels,
I see before my eyes mirrors, rainbow reflections
Of Beauty, the fairest symbol of all that circle me
Rejoicing. Yea, in this fairest of gardens you call
Heaven, I see smiles of Grace and Love: songs
Extolling the praise of my Lord, who to prostrate
Before my exalted soul, gave you a sacred command.
Wind! freshest of creation, the smile of open sky,
If thou art the lucid stream of God's healing breath,
Animating source of life that on ethereal firmament float,
Breathe within my soul thy reality, thy secret of existence.
Air, so art thou called, thou fillest the tranquil Space
With perfume, and my soul with thy fragrance sweet
A fainting exaltation receives. Resound through thy music
The voice of God, and enshrine me in the ecstasy of prayer
As thou enshrinest my body in thy airel streams.
My Lord, what are these green creatures? the embellishments

It also tried with success to a great extent to check the spread of so many ghastly diseases in various countries.

From all this, it will appear that the League has a very bright future. If it is successful in achieving her aims, peace would dwell everywhere. Wars will be stopped. For the sake of the settlement of international disputes, no one would resort to war but to some peaceful means.

Manly forces would take the place of the brutal ones. There would be no antagonism between the different countries and nations and all the world would be united together. It would get rid of the horrible consequences of war. People would look to progress and not to trample down others. Friendly relations would prevail between one country and the other and the world would thus be one.

P. G. KULKARNI,
B.A., LL.B. (PREVIOUS.)
*Osmania University College.*

The Secretariat consists of a Secretary General and such staff as is required. The Secretary is appointed by the Council with the approval of the Assembly and the staff by the Secretary and the Council. Every treaty or international agreement must be published by the Secretary, otherwise it is not valid.

The Permanent Court of Justice consists of eleven Judges and four Deputy Judges. It delivers opinions and judgments on all disputes regarding international law. But the only thing wanting is the sanction to enforce its decisions. It cannot compel the members to abide by its decisions. The League is defective in this respect.

The International Labour Organization works through its governing body, settling the agenda and conferences to which every State-member sends four delegates, and dealing with the matters affecting the workers.

Such is the Constitution of the League. The achievements of the League may be briefly surveyed here.

When the relations between Sweden and the Aaland Islands became very bitter, the League, at the appeal of Britain, settled the matter to the satisfaction of both the parties.

It settled the Italo-Greek dispute which arose at the murder of an Italian General in Greece quite satisfactorily.

It also settled Franco-British dispute regarding the people living in French territories whom Britain claimed to be her subjects. A friendly settlement was arrived at between them.

For the present, the League is striving hard to bring about a solution of the Manchurian problem. The present is a very critical time for the League. Upon it depends the success of the League. It has appointed a Commission for this purpose that has begun its work. It is hoped that the League will be successful here also.

Not only did the League prevent so many wars but it worked in other respects also.

In 1922 Austria was in a great trouble. Her economic condition was very bad. The League did much to enable her to balance her budget.

At the end of the War, President Wilson laid out his fourteen points. One of them was that 'a general association of nations must be formed for the purpose of affording mutual guarantees of political independence and territorial integrity to great and small states alike.' A Commission was appointed for this purpose. It presented its text to the Peace Conference of 1919 and the League came into being in 1920 with its headquarters at Geneva.

The aims of the League, as the preamble says, are 'to promote international co-operation and to achieve international peace by the acceptance of obligations; by the prescription of open, just and honourable relations between nations; by the firm understandings of international law as the actual rule of conduct among Governments; by the maintenance of justice and a scrupulous respect for all treaty obligations in the dealings of organized peoples with one another and not to resort to war in any case.'

The original members of the League were the Allied and Neutral States except Russia. Any self-governing State, dominion or colony could become member of the League if its admission was agreed to by two-thirds majority of the League. The original members were forty-two in number but some more were admitted afterwards.

The constitution of the League is as follows:

It consists of an Assembly, a Council, Secretariat General, a Permanent Court of Justice and an International Labour Organization.

The Assembly is the supreme body in the League. It is formed by representatives of all the member-States. Every nation has a single vote although it can send three representatives. The powers of the Assembly include the discussion of all matters affecting the League, the admission of new members and the approval of the appointment of the Secretary General. All decisions of the Assembly must be unanimons except those of very little importance.

The Council is a smaller body. It is competent to deal with all matters falling within the sphere of the League. To bring about plans for the reduction of arms and to take due steps in the case of declaration of war are the main functions of the Council.

# THE LEAGUE OF NATIONS.

THE experience of the 19th century and of the Great War showed the world that peace was essential for its progress. It also showed the serious results caused by war. What is the use of killing men and wasting wealth over war—a thing quite unnecessary? Is it impossible to solve international problems without war? This sort of ideas led to the foundation of the League of Nations.

The League has its origin far back. During the mediæval and the early modern period, recourse was often had to the Pope as an arbiter between contending princes. The Pope was the religious leader and so the Kings were expected to abide by his decision.

The idea of international arbitration took practical shape in the 19th century when the people came to know and feel about the costliness of war, the dislocation that it causes not only to the industrial life of the belligerents but to that of all countries associated with them—a fact driven home by the growing interdependence of general financial and commercial operations throughout the world.

A further stage of development was reached in the attempt to constitute a permanent tribunal for settling international disputes. At last a successful plan was put into operation by a convention signed at The Hague by the Great Powers in connection with the Peace Conference of 1899, when a permanent court of arbitration was established.

Then came the Great War. It gave a serious blow to the whole world and made it known to all that wars were no more wanted. Fortunately the world-position immediately after the war was such as to help the idea of establishing peace everywhere. This general desire resulted in the formation of the League.

East . . . . She has brought a new note into the English verse of the day.' From this viewpoint the significance of Sarojini's poetry and her place in the Indo-Anglian poets is clearly shown.

Like all great men, she would leave behind her 'foot-prints in the sands of time.' Her 'lamp' would be of special value to those who

> 'Like plants or vines that never saw the sun,
> But dream of him where he may be,
> And do their best to climb and get to him.'

S. SHAH MOHAMMAD,
VI SCIENCE,
*Osmania University College.*

The services rendered by her to India are known to every one. It would be tiresome to enumerate all these here. Suffice it to say that she is in the front rank of leaders of Indian life and thought.

Along with her public services, reference should also be made to her amazing oratorical powers. She has always shone in public speeches. The charm of her orations lies in her imaginative flights, rhetorical outbursts and poetic phraseology no less than in her musical tone and amiable personality. She has been aptly called 'Bulbul-i-Hind' or 'The Nightingale of India.' Those who have heard her speak, would readily recognise the justification of that epithet.

We may now pass on to her poetry. But there is no attempt on our part to make here a critical survey of it. A few mere obvious points can only be touched here.

She was from her early childhood interested in art and poetry and used to 'manufacture' poems. They were all imitative and were written, as Sir Edmund Gosse says, in 'a falsely English vein.' Our thanks are also due to this eminent critic who bade her burn all this verse and advised her 'to be a genuine Indian poet of the Deccan.' The perusal of her poems will clearly reveal how the poetess has been true to this dictum. She once wrote to Sir Edmund: 'While I live, it will always be the supreme desire of my soul to write poetry—one poem, one line of enduring verse even.' In her childhood she even dreamt to be a Goethe or a Keats for India. But her active public life, while of great benefit to people at large, has not been without injury to her poetic faculty. Having read the three short volumes of her poetry, one feels sorry that she has not written more. Still these thin volumes contain much of the best poetry of our age. A critic in the *Review of Reviews* said of the *Golden Threshold*: 'Exquisitely musical collection of oriental lyrics and poems.' This is true of her other books also. The following criticism of M. Bronney clearly brings out the features of her poetry: 'Her verses are songs. They have the (authentic) lyric cry. But they have something more significant, something rarer. In the forms familiar to the West, she expresses something of the soul of the

# SAROJINI NAIDU

THE modern history of India can show only a few great persons. One of these is Mrs. Sarojini Naidu, a bright star of Indian notability. She is great in the real sense of the word and will ever remain so in the annals of India. Her fame has almost travelled from pole to pole; her popularity increases day by day. The secret of this is to be found in her greatness as a leader no less than in her moral dignity. She appeared at a critical moment in our country and like

'A lady with the Lamp shall stand
In the great history of the land.'

It will be interesting to know the 'lady' and try to understand 'the lamp' with which she points us the way to wisdom and happiness.

Sarojini Chattopadhya was born in 1879 in the city of Hyderabad. She received her early education at the Grammar School. Having distinguished herself there, she proceeded to England as a Government Scholar and had a good opportunity of cultivating her gifts of head and heart. After her return to Hyderabad, she was married to Dr. M. G. Naidu. But being a born poetess and politician, she was rather fitted to command people and guide their destinies than to be bound by petty affairs of domestic life. Hitherto, she devoted herself to poetry and politics—to quote her own words,

'To achieve my destined deed
Of song and service for my country's need.'

Having plunged herself in politics, she has ever since remained the spirit incarnate of national India. How deep and sincere is her address to the spirit of Mother India!

'Waken, O Mother, thy children implore Thee,
Who kneel in Thy presence to serve and adore Thee,
The night is aflush with a dream of the morrow,
Why still dost thou sleep in thy bondage of sorrow!'

the desert, the children of vast plains. They were utterly ignorant of the qualities of depth, moisture, clouds, fertile land and frontiers ; but after they had left their own country and applied their latent powers to poetry, logic, grammar, astronomy, and the construction of roads they showed the greatest possible aptitude for all these sciences and arts. Lastly the Turks, emerging from savage habitations, have attained the highest perfection in riding, hunting, husbandry, and the art of taking out expeditions and conquering foreign lands.'

HAROON KHAN SHERWANI.

search for the paradoxical always make him study peoples who had not then acquired a dominant station in the history of the world, and it is this which makes his work called *The Praise of the Turks* extremely interesting to us. This nation had hardly begun its onward march, and it is probably the first work in any language which talks about them in such detail and gives them so much importance. He is also interested in the respective qualities of the different races and deals with them whenever he can. Before we close we should like to give an extract from his work on the Turks in order to illustrate what we have just said.

'We must remember that every nation, every century, every generation and every race makes a mark in certain definite arts, for which the Divine Providence has especially endowed it and to which others cannot attain. Thus the Chinese excelled in handicraft, the ancient Greeks in philosophy and literature, the Persians of the Sassanian period in government, the Arabs in all that we are going shortly to describe, the Turks in war. We know that, generally speaking, the Greeks who were experts in investigating the causation of things were not skilled in commerce, arts and agriculture, on the other hand they did penetrating researches into the human mind to such an extent that they became the inventors of various instruments which were either useful in a physical sense or else satisfied the æsthetic sense of man, such as the balance, the astrolabe, time-keepers, flutes and organs; and processes pertaining to medicine, calculus, geometry, music, machines of war and other articles of the same category. In the same way the Chinese excelled as blacksmiths and goldsmiths, woodworkers, turners, weavers, embroiderers, and manufacturers of brilliant colours, in fact all that could be achieved by handwork whatever might be the quality of the raw material or its price. In a word, the Greeks speculated on theories and paid little attention to their application, while the Chinese paid more attention to practice and did not mind much about theories; the former were the *savants*, the latter handicraftsmen.

'Turning to the Arabs, we are afraid that in the beginning they were neither merchants nor artisans, nor physicians nor mathematicians, nor agriculturists, but were only the denizens of

book passes from one copyist to another in an altered form till it is full of erroneous and defective material.'

After this Jahiz takes up the picture he has just drawn up and makes certain pertinent remarks in order to moderate its rather exaggerated parts. He says that we should not conclude from this criticism (as certain contemporary Arabs did); that the poetical form is more solid than prose. This was the opinion of the Hindus at the time of Alberuni, for they chose to transfer all thin sciences to *Shloka*. As a matter of fact poetry has never been the vehicle of real scientific knowledge, for all that pertains to the sciences of instruments of business is found in prose works such as those of Euclid, Galienus, Almajest and others whose works were translated by Al-Hajaj. In spite of all the mistakes common to all translators, there remains in them a basis which is both sound and durable, and what is wanting is supplied by nature.

Jahiz then talks with great admiration about contemporary works and enumerates all the sciences and arts which writing had served to transmit. After this he discusses a number of scientific inventions which were due to mere chance.

Jahiz's chapters are a mixture of ideas which may perhaps be a little incoherent but are always full of facts and thought. I will not go so far as to affirm that all his chapters are equally rich, but what I can say without much fear of contradiction is that the reader can find something useful in every one of them. We will note certain passages which are worthy of interest to the student and which deserve more than a passing consideration. In his treatise entitled *The Circle and the Square*, the author puts a long series of questions on all kinds of subjects such as History, Mythology and Geology—in fact presents a real synopsis for an encyclopædia of the ninth century. Again in his book called the *Black and White* there is a summary of the history of the Zangis or the inhabitants of Zanzibar, which is full of the names of local heroes and their conquests, and of facts which were very little known in those days but which might be useful to a student of race psychology. Jahiz is very much interested in this kind of psychology and always comes back to it. His originality and

him and what he considers indispensable to be handed over to others; on the other hand what he should do is to use words and expressions of exactly the same meaning as that which was originally intended by the author of the book. Since when, we should ask, did Ibn-i-Patrik, Ibn-i-Na'ima, Abu Kurrah, Ibn-i-Fahr, Ibn-i-Vaheli, and Ibn-i-Mukffa become embodiments of Aristotle, and can we call Khalid another Plato? In a word, the expression of the translator has the same connection with the translation as his knowledge has to the subject matter.

'Moreover the translator should be conversant with the language of the original work as well as of the translation in such a manner that he should be equally at home in both. Now when we meet a person who talks two languages we clearly see that he corrupts both of them, and what really he does is to draw from the one while he is speaking the other.

'The more the subject is difficult, the fewer are those who know it, and the more are the mistakes committed by the translators. And there are but few translators whose knowledge corresponds exactly to the erudition of the original writer. We see this state of affairs recurring in the matter of books on geometry, astronomy, calculus and music, as also in the translation of books on religion, where the meaning ought to be exactly the same as the original. If a person well-versed in Greek transmits the meaning to another who is well-versed in Arabic, while the latter knows much less of Greek lore than the former, then naturally the sense transmitted is not comprehended by him, and in the same way a Greek writer who does not know as much Arabic cannot transmit the sense intended.

'Then comes the question of the difficulties of copying out the manuscripts, due first of all to mistake in the text and then to the copyists themselves adding to the number of mistakes already existing. We can never expect a paid copyist to correct the mistakes he finds in the text, especially when the writer himself has not taken the trouble of revising the manuscript. Then a manuscript once copied has the same value for a subsequent copyist what the original manuscript had to the first one; and thus the

that it only means that the Arabs knew nothing either of Greek poetry or of Persian poetry, and that the memory of the Persian tradition was preserved before Firdusi's time mostly in the form of prose. But there the question arises what was the cause of this ignorance? I am afraid I cannot answer it here, but leave it to those who take a larger interest in literary history. Jahiz who seems to have known well the sciences of the ancient Greeks, does not even suspect the existence of its poetry. 'The books of Aristotle and Plato, and later of Ptolemy and Hippocrates and so many others were preceded for centuries and contains what we may call the shadow of poetry. Just think of the surroundings of Zorarah, calculate the years which intervened between his death and the birth of the Prophet, and then you will find that the art of poetry dates back to nearly a century and a half, and the most two hundred years before the advent of Islam.'

Jahiz quite correctly continues to say as follows, 'The merit of this poetry cannot be really appreciated except by the Arabs and by those who are conversant with their language, for poetry cannot be translated and with the meter disappears all that made it beautiful and sonorous. It is nothing but prose, only inferior in quality to a translation the original of which was not poetry but prose itself.' And in this connection he makes some fine and judicious remarks on translators, their duties, the difficulties experienced by them in translating books, and even goes so far as to formulate a very pretty theory of the possible errors and of the criticism of the texts.

'All the nations, red and black, have the need of knowing the rules of religion and art, and to derive conclusions from their past and present experience. This is the reason why they have translated the books of the Hindus, and the wisdom of the Greeks and the literature of the Persians. Books of one nation have been translated by another nation, of people of one century by those of another century, of one language in another language and they finally come down to us. There are some who say that a translator can never exactly render the thought of an author with all the detail of his intention and the delicacies of his vocabulary, that he only keeps the essential part of what has been given to

'In the days of paganism people sent for a writer whenever they had to preserve the memory of an oath or offering, both on account of the importance of the event and for the purpose of commemorating it.' This is really found among all the nations of the world. 'All the nations love to preserve in some way or other their traditions and the meritorious deeds of their ancestors. The Arabs before the advent of Islam brought poetry to their service. It was poetry which consisted of Qasidas describing the deeds and importance of the heroes in the life of the nation. The Persians on the other hand preferred to commemorate their traditions in their monuments. Thus for example the White House at Istakhr built by Ardeshir, the monument at el-Mada'in, as well as a number of towns, fortresses, bridges, sepulchres and highways. This idea of erecting monuments was taken up by the Arabs as well. They left off writing poetry and built Gomdan, the castle of Moarab and of Shuoob, the Ablaq-el-Fard etc. The Persians never allowed any one except the nobles to build such monuments or to adopt names which were regarded as marks of nobility. In the same way special rules were made for tombs, baths, green domes and such other buildings.'

'But,' remarks Jahiz 'books are more lasting than brick and mortar, for it is the wont of the kings to efface the traces of their predecessors and to demolish the buildings erected by their enemies, and numerous towns have been razed to the ground with this object. This has been the end of the Persian and pre-Islamic Arab castles. 'Uthman demolished the dome of Gomdan and razed to the ground the forts of Medina; Zaid destroyed all the castles and all works belonging to Ibn-i-Amir, and our rulers have demolished the Syrian towns belonging to Marwan's descendants.'

Then Jahiz goes on to a subject which seems a bit curious at first sight and seems to show us the philosopher's ignorance after the exposition of so much learning. The author tells us that poetry is still in its infancy and that the first who attempted it are Imra-ul Qais, son of Hujr, and Mahazahel (Labeed) son of Rabee'a the famous authors of one of the *Moalakat*. Jahiz thus tries to make us believe that the poetry of all countries originated in the *Moalakat*; but when we pass the situation under review we feel

display only served to distract the mind from the ideals of humility.

In order to prove what we have just said, it is enough to point out that the books of the Zindiqs do not contain any information about rare objects, literary pieces of any merit, description of foreign philosophers or question pertaining to rationalistic theology, instruction in arts, construction of the implements of agriculture or war, and inter-sectarian discussions; in fact that all that they do contain is about Light and Darkness, nuptials of the Satans, loves of Demons, the fables of Shakloon and owls and other ridiculous stories of the same category.

Then follow a number of questions, verses, conversations and anecdotes about book-lovers where we come across many charming details. Somebody asked a lover of art to show him the anthology of a certain author. This was bound in Koofa leathers, was wrapped up in two covers and was written by a superb caligraphist. When he was told that he had really wasted the money spent on the purchase and the upkeep of the book he replied, 'No Sir, science always gives back in direct proportion to what one spends on it, so if I could have only committed this work to memory and had given it in charge of my intelligence, in that case I would have wasted my efforts.'

From books Jahiz passes to inscriptions and philosophises about them. He enumerates some well-known inscriptions of his own time and gives them his mature thought.

'In olden days men inscribed on rocks by means of a chisel. These inscriptions were either sunk in or were in relief. They generally gave the date of an important event, preserved a treaty concluded between two important parties, commemorated a proclamation which was considered useful to the public or else perpetuated the memory of an illustrious personage. Such are the inscriptions on the dome of Gomdan, the gate at Qirwan and Samarkand, the column at Moarab, the basement of el'Mushaqqar on the Ablaq-el-Fard and the gate of Edessa. These inscriptions are found in well-known places on sides frequented by men and in such places as are comparatively strong and safe, in a word, on sites which are easily visible to the passers-by.'

tell you how many smaller works I have read which have not added a single iota to my knowledge.'

A little later Jahiz begins to talk of a certain Manichean sect called the Zindiq, and going into the question why they were such voracious readers, he passes on to the delicate problems of religious psychology and gives us an insight into his extraordinary erudition. 'Ebrahim-el-Sanadi told me one day that he emulated the taste of the Zindiqs for snow-white leaves, black-ink mixed with borax and beautiful writing, and that he never saw either paper or caligraphy like theirs. He remarked that if one was a lover of wealth and economy his expenses in purchasing books proved that he was fond of sciences as well, which again goes to prove the elevation of his character. Thereupon I replied as follows: "It seems to me that the money the Zindiqs spent on their books very much like the money which the Christians spend on their churches. If the books of the Zindiqs were the works on sciences and philosophy, of methods and demonstrations, or else where treatises which open out the gates of the Arts or the routes of Commerce to us, or consisted in the description of constitutions of societies, mathematical calculus, and different aspects of matter in which man busies himself, then only we would come to the conclusion that they are honouring the sciences. But it is only religious sentiment which makes them honour their own sect. The money they spend is like that of the Magians for their altars, of the Christians for their golden Crosses, of the Hindus for their sacred places and of the Buddhists for their images." '

If the Musalmans love the same sentiment, if they think that this display of splendour is conducive to piety and leads them towards a humbler way of life, then they would be able to do much more by means of their superfluous wealth than ever the Christians did by their resources. Once when I visited the great mosque of Damascus the Governor of Syria had adopted this method and we know that in those days few wanted to visit it. We also know that when Omar-ibni-Abdul Aziz came to the throne he covered the over-beautified parts and had the chains of the chandeliers re-annealed, because he thought this was more in agreement with Islamic spirit and that this kind of

*Parasites*, *The Book of the Misers.*[1] His greatest book *The Book of the Animals*[2] is a fairly large work and it contains not only a description of the animals but also a number of chapters which have nothing to do with the animal world but which contain personal ideas, literary thought, verses and anecdotes suggested to our author by the animal world. If one were to read this book as a scientific treatise on zoology one would be greatly disappointed; on the other hand if the book is read without any prejudice and without expecting any definite plan one would find a lot of sequence in it.

I do not think that we can evolve much of a philosophy or a school of thought from Jahiz; but we do not find in him is a tremendous amount of philosophic spirit and the most intense taste for intellectual life. If we open his *Treatise on Animals* we would be greatly surprised to find chapters in praise of books, history and literature and we would be much amused by the names of the earlier chapters and their mutual incoherence.

Oriental literature is full of passages on libraries and book-lovers, and instances of this may be found in el-Fakhri and in Yakut's stories.[3] Jahiz who preceded both these authors treats the subject at length and seems to take greater interest in it. He talks about the love of voluminous books (nowadays we prefer smaller ones!) and expresses the following opinion which testifies at least to his great zeal for literature. 'Ibn-i-Jehm says that when he began to like book from which he hoped to get some instructions, people saw him time after time turn over the leaves in the fear of finding that the subject-matter did not unfold itself, and the book, so to say, did not open its heart to him; while if the book was fairly large, if it had many pages and each page many lines, then he assured himself that he was bound to get enough compensation for his troubles and he was overjoyed.'

He again quotes Ibn-i-Jehm as follows: 'I have never read a large work without getting some benefit out of it, but I cannot

[1] *The Book of the Misers ;* Van Vloen Editions, Laiden, 1900.

[2] *Kitab-ul Haywan ;* edited by El-Haj Mohammad Effendi, 1325 A.H.

[3] Thus for instance, the description of a beautiful manuscript in the 'Thousand and One Days' (Paris, 1844, to 183), Story of Hasan Bin Abdullah, or, the Keys of Destiny.

struck by paralysis which affected his right side to such an extent that it was necessary to massage it regularly with sandal and camphor. At the same time the left side was so much enervated and benumbed that it could be cut open by a pair of scissors without the body feeling it. Jahiz died in 255 A. H. (869 A. C.) at the ripe old age of over 90 years.

Musoodi quotes some very fine words from him which recalls the spirit of our own 18th century. When somebody came to see him in his old age he replied 'I suffer from a double ailment, one physical pain and secondly the burden of my debts; in a word, my illness consists of two maladies which counteract each other, of which one is sure to bear me to the grave; I am sure the more serious of those maladies is my seventy odd years.' He told his nephew that he had blamed a friend for having indulged in too many works of a charitable nature. He said to him 'my friend, you spend your forces, weary yourself and tire away your pony: it will be well if you moderate yourself', to which this man answered in the following beautiful words: 'Sir, neither the songs of the birds sitting on the top of the trees nor the voice of the beautiful singers singing to the accompaniment of lute, nothing to me is so charming as the delightful melody of some words of thanks uttered by those whom I have rendered some little service.'

Coming to his writings, we do not think there is an author more capricious than Jahiz, and whenever he touches any subject he sees in it an excuse for a large digression. He is always passing from one set of ideas to another but is ever full of spirit and liveliness, ever playful and ever interesting. He is a man of spirit even in his thoughts; his worst blunders are accompanied by poignant arguments which set off those blunders to a large extent, as can be illustrated by the way in which he has dealt with the question of the origin of Poetry.

The titles of his books are charming: *The Envious and the Envied*, *Superiority of Blacks over Whites*, *The Circle and the Square*[1], *Struggle of Spring with Autumn*, *The Book of the*

[1] Jahiz's eleven treatises, collected under the name of *Majmoo'ai Rasa'il*; Cairo, 1324 A.H.

# ISLAMIC POLITICAL PHILOSOPHY

(*Continued from the 'Osmania Magazine', Vol. IV, No. 1.*)

## 3. JAHIZ.

AMONG the philosophers who do not follow any particular system and have a peculiar way of expression there is one who is very little known in the west, and that is Abu Uthman 'Amr Bin Bahr el-Jahiz.[1] Jahiz, who really belongs to a very old period of history, flourished as long ago as the ninth century A. C. He was a native of Basra, then a centre of intellect and thought, and of religious and philological studies. It was under the direction of Nazzâm that he took part in the religious movement of the Motezilites, and later on himself became the head of a special school of thought which bears his name. The Motezilites are a sect of Muslim rationalistic theologians, or perhaps, free thinkers, not thereby meaning the unbelievers, but such philosophers as are prone to consider the religious problems that come before them according to their own particular method and do not follow the method adopted by some previous authority.

Jahiz was an extremely learned man and had a very lucid way of expressing his thought. He was ugly in his appearance and it is said when he was presented to Khalifa el-Mutawakkil and recommended to the tutorship of his children, this sovereign was so much shocked by his bad looks that instead of appointing him to the honoured post he gave him six thousand dirhems and requested him to go back home. His surname means 'one with a protruded pupil' which was one of the prominent features of his eye. After being dismissed by Mutawakkil, he continued to live at Basra, wrote a number of books and acquired a very great reputation. The story is told of a Bermicide, who while returning from a tour of the Indies and passing through Basra wanted to visit Jahiz, so that he might be able to tell his friends that he had seen this great *savant*. When he became old he was

[1] *Vide* Brocklemann : *Geschd. ar. Litteratur*, I, 152.

His other works are not widely read. Among his miscellaneous poems many are charming and are addressed to God invoking Him :—

'भावेंवीण भक्ति भक्ति वीण मुक्ति । बळेंवीण शक्ती बोलूं नये ॥
सायास करिसी प्रपंच दिननिशीं । हरिसी न भजसी कोण्या गुणें ॥
ज्ञानदेव म्हणे हरी जप करणें । तुटेल धरणें प्रपंचाचें ' ॥

' Bhakti without belief, and salvation without Bhakti are mere will-o'-the-wisp. Get God pleased and rest quietly. Why do not you think of Him? But on the other hand are wasting your energy in this worldly life. Dnanadeo says, ' If you take even the name of God you will be freed from this snare of the world.'

He died in the year 1218 S. at the age of twenty-one. His last six years were spent in pilgrimage, from which we can conclude that he finished *Dnaneshwari* in 1212 S. in his fifteenth year. In English literature we find that Keats died very young, at the age of twenty-six. No poet has the honour of achieving such long enduring fame at such an early age, exceeding in both quantity and quality. All who came after him are indebted to him in some way or other, either for language or for thoughts. Secondly, he was the founder of the Bhakti movement in Maharastra which is the prevailing factor lasting to our day. His name is on the lips of all Maharastrians from the young to the old and from the rustics to the learned.

All his followers, down to Moropant, another great poet of the century, have paid tributes to him. This shows the great influence of the poet's work on posterity.

R. Y. MAHAJAN,
IV YEAR,
*Osmania University College.*

Dnaneshwari commands our admiration for three main reasons. We find in it the combination of matter and manner. Philosophic ideas are expressed in homely words in a charming and sweet language and it is held sacred by all of us for its teachings. Those who are of opinion that poetry and science have their different territories and knowledge, poetic genius and imagination cannot go together should study this book. A critic has observed that, 'he has created a new world profoundly rich in thought and diction which when borrowed or stolen would not come to an end.' Thus he is among the few Marathi poets who had brilliant success. To take Marathi quotations here in support of this statement from other eminent writers would be unnecessarily lengthening the subject.

But as a general rule every good thing has its own defects. Here sometimes we find repetitions of the same thoughts. At certain places the subject is stretched unnecessarily and the poet himself was aware of this. But in its support he makes very pertinent remarks :—

'आणि घांसा आंतील हरळु । फेडितां लागे वेळु ।
तें दूषण नव्हे खडळु । सांडावा कीं ॥
कां सर्पचोरां चुकवितां । दिवस लागलिया माता ।
कोपावें कीं जीविता । जिताणें कीजे ॥
परि यावरिल हें नव्हे ॥ तुम्ही उपहासिलें हेंचि बरवें ।
आतां अवधारिजो देवें । बोलिलें ऐसें' ॥

'While taking his meal, a man gets a particle of sand in a mouthful, then he should stop at once and take it off. Will it be considered a fault that he requires more time to finish his meal for this reason? Or will a mother get angry with her son when he is late in escaping a scoundrel on his way? In the same way though my speech is very lengthy, but it was unavoidable and therefore pardonable.'

2

are of opinion that Bhakti came into being when the Hindus came in contact with the Mohammedans. But from the quotation given above we have sufficient reason to think it otherwise.

Man is expected to perform his worldly duties and then in the intervening time concentrate his thoughts upon God. But how to do these intermingled duties? He makes it clear by citing an example.

' Once there was a poor man passing his life wretchedly; but after some years a spirit conferred his favours upon him. He promised the man that he would do anything for him, provided that he would always keep him engaged in some kind of work, otherwise he would devour him. The man as he was poor, accepted his terms, because he thought that he had sufficient work for him. Then he asked the spirit to provide him with such things as he lacked, to lead a happy life. But the spirit brought all these things one after the other in a short time. Whatever did he tell him the spirit would do it in a moment. The poor man began to be afraid of him. He then ordered him to bring one of his relatives from a great distance. As the spirit went away the poor man went to his neighbour and related him the story saying that he had no work left for the spirit. He requested him to save him from the spirit. When the spirit returned after performing his work he asked him for another piece of work. Then the man ordered him to obey his neighbour, who in his turn asked him to bring a long bamboo and to fix it half into the ground. The spirit with his miraculous power did it in the twinkling of an eye. Then he ordered him to go on climbing to the top and descending to the bottom when he is not wanted for any other work. And thus the poor man was saved.'

What can we infer from this? As the spirit had only one work of climbing and descending and had to think of that pole alone, in the same way a man should think of God. But as at times he had to obey the command of the poor man so also a man should perform his worldly duties. This we can gather from the story, leaving aside the spirit and his acquaintance with man. Thus he had shown his imagination wherever possible.

Dnaneshwar loved his religion and strictly followed it. Though he did not preach it from a pulpit that the caste-system should be abolished yet, as the quinine pill, when sugar-coated is swallowed up without any disgust, he has put his views before us under cover. A stern preceptor orders us to do a thing though it is against our will. We may carry out his orders, but with an unwilling heart. On the other hand a poet, like a gentle mother, takes the same work from us asking us in a loving tone. His poetry has done the work of the second kind. He says :—

'ऐसा अवधाचि परो पांडवा । जोहीं आपुलिया सर्वभावा ।
जियावयालागीं वोलावा । मीचि केला ॥
ते पापयोनिही होतु कां । ते श्रुताधीतहि न होतु कां ।
परि मजसी तुकितां तुकां । तुटो नाहीं ॥
राजाज्ञेचीं अक्षरें आहातो । तिये चामा एका जया पडतो ।
तया चामासाठीं जोडतो । सकळ वस्तु ॥
कां खैर चंदन काष्ठें । हे विवंचना तंवचि घटे ।
जंव न घापती एकवटें । अग्नीमाजीं ॥
तैसें क्षत्री वैश्य स्त्रिया । कां शूद्र अंत्यजादि इया ।
जाती तंवचि वेगळालिया । जंव न पावती मातें' ॥

' Those who think God as their sole support of life, they may not descend from noble families and may not possess sound knowledge of the Vedas, are in no way inferior to me. The skin is a worthless thing but when it gets the royal stamp, it surpasses all other things in value. Family, caste or creed are no hindrances if a man becomes one with me. And when he attains this state his previous connections are not reckoned. As the distinction between timber, sandal and others remains so far as they are not placed on fire, in the same way Kshatriya, Vaishya and Sudra have their separate existence till they do not reach God.'

Now let us see what we can gather from these thoughts of his which found their expression here. As we said before Dnaneshwar lived and finished his career as a poet long before the Mohammedans invaded the Deccan. This Bhakti (भक्ति) movement in Maharastra had its origin long before his time. Some

their attempt they come across temporary happiness and rest themselves contented in its enjoyment without reaching Him.

'पाहे पा दूध पवित्र आणि गोड । पासीं त्वचेचिया पदराआड ।
परि तें अव्हेरूनि गोचिड । अशुद्ध काय नेघती ॥
कां कमलकंदा आणि दुर्दरीं । नांदणूक एकेचि घरीं ।
परि परागु सेविजे भ्रमरीं । जवळिलां चिखलुचि उरे' ॥

'A small tick, living near the dug of a cow, feels happy by sucking blood from the place, without an idea that there is sweet milk inside there, or a frog, which makes its home near the stem of a lotus flower in mud, does not derive any pleasure from its sweet scent, but is contented to remain in mud and the bees coming from different directions enjoy that scent. In the same manner though I am in your heart you cannot see me.'

This world is full of pleasures and miseries but a man, who is a man in the real sense of the term, neither becomes glad while enjoying pleasures nor is affected when plunged in grief. Friends and enemies, honour and insult are alike to him. He makes no distinction in them. He says :—

'कां घरिच्चियां उजियेडु करावा । पारखियां आंधारु पाडावा ।
हें नेणेंचि गा पांडवा । दीपु जैसा ।
जो खांडावया घावो घाली । कां लावणी जेणें केली
दोघां एकचि साउली । वृक्षु दे जैसा ॥
नातरी इक्षुदंडु । पाळितया गोडु ।
गाळी तया कडू । नोहेचि जेवीं' ।

'As the lamp does not know that it should lighten the master's house and leave in darkness the neighbour or as a tree distributes the same shade both to the man who planted it and the one who axe in hand is ready to cut it down, or as the sugarcane makes no distinction between the farmer who grows it by watering and one who takes its life essence out of it by putting it into a crusher, but gives the same sweetness to them, in the same way a man should receive good and bad alike without in any way being perturbed in the mind.'

till the meaning is perfectly clear. These reveal his close observation and keen insight.

'कृपण चित्तवृत्ति जैसो । रोंवोनि घाली ठेवयापासीं ।
मग नुसधेनि देहेंसिं । आपण असे ॥
कां अजात पक्षिया जवळा । जीव बैसवूनि अविसाळां ।
पक्षिणी अंतराळां । माजीं जाय ॥
नाना गाय चरे डोंगरीं । परि चित्त बांधिलें वत्सें घरीं ।
तैसें प्रेम येथिंचें करीं । स्थानपती' ॥

'As a miser's heart often dwells upon the wealth that he has kept underground, though his body performs its duties or—as a female bird always thinks of its young ones in the nest though taking a high flight in the sky or—though the cow is grazing in the field her mind is wholly taken up by the thought of her calf at home, in the same way, oh, man, you should always think of nothing but of me,' says Lord Krishna.

He says that human being is bound to perform the duties which are laid upon him. But whatever he does he should do it irrespective of consequences. This he expresses in a beautiful way :—

'पिपंळ वांचिया आशा । न शिंपिजे पिपंळ जैसा ।
तैसिया फळ निराशा । कीजती कर्मे ॥
सांडूनि दुधाचो टकळो । गोंवारी गांवधेनु वेंटाळो ।
किंबहुना कर्मफळीं । तैसें कीजे' ॥

'As the pepul tree is not watered in the hope of its fruit, or as a cowherd keeps the cattle of the village and looks after them without an idea of having milk from them, in the same way work should be done without the least hope of reaping its fruit.'

He says that God's abode is nowhere but our heart. Men try to find Him out and go on seeking outside themselves. In

patiently go through his work he will learn from his many extracts, that he was not proud of his power.

'नातरी बालक बोबडा बोली । कां वांकुडा विचुका पाउलीं ।
तें चोज करुनि माउली । रिझे जेवीं ॥
तेवी तुम्हा संतांचा पढियाथी । कैसेनितरी आम्हाथरी हो ।
या बहुवा आळकिया जी आहो । सरगो करित ॥
अहो पुंसा आपणचि पढविजे । मग पढे तरी माना तुकिजे ।
कां करयलेनि चोजें न रिझे । माय जेवी ॥
तेवीं प्रभु मी जेंजें बोलें । तें प्रभु तुमचेंचि शिकविलें ।
म्हणोनि अवधारिजो आपुलें । आपण देवा ' ॥

' A child utters unintelligible words and walks with faltering steps but takes pleasure in them. With that love you should accept this. We teach a parrot a few words and when it reproduces them we feel glad, or does not the mother become happy when she finds that her son has obeyed her command? In the same manner, oh, wise men, whatever I present before you, is nothing but your own teaching. So listen to your own words. I am only an intermediary.' How very modest!

As his was the first trial in Marathi, nearly in every chapter he assures his readers that this language is capable of expressing philosophic ideas.

'मूळ ग्रंथीचिया संस्कृता । वरि मऱ्हाटी नीट पढतां ।
अभिप्राय मानलिया उचिता । कवण भूमि हें न चोजवें ' ॥

' If this Marathi commentary will be read carefully after having gone through the original Sanskrit book (the *Bhagawadgita*), it will be difficult for the reader to form a correct estimate to decide which is the best.

In order to render the subject easy and simple he employs a simile, but if any doubt still exists he gives another and another

his mother tongue. He had to face the severe opposition from his contemporaries. Though he was the first poet in Marathi yet he came out successfully and his eminent work is widely **read** to this day.

The Marathi poetry then flowed through a different channel. It was not the time to address insignificant things like 'A Mouse' or 'A Leaky Pot.' The poetic field of that day was very narrow. The definition of poetry of his and his predecessor's age ran thus:—

'अलवण हरीवीण कविता' (वामन)

meaning thereby 'poetry not describing and containing the name of God is like a pudding without salt.' He not only adopted Marathi as his medium but also left aside all the meters which were in vogue in Sanskrit poets and used a new meter quite congenial to Marathi atmosphere, a meter which, no doubt, reached its perfection in his own hands. A certain influential poet acknowledges that the palm, in this meter, belonged to none but to him. He says :—

'सुश्लोक वामनाचा अभंगवाणी प्रसिद्ध तुकयाची ।
ओवी ज्ञानेशाची किंवा आर्या मयूरपंताची' ॥

Herein he enumerates different leading Marathi meters and the poets who had honour to bring them to perfection. . . . . . . 'owi' belonging to our hero.

This book is in eighteen chapters containing nine thousand couplets. He has imagined himself as seated in an assembly of the learned, preaching the essence and teachings of the *Bhagawad-gita*. The ninth and the eleventh chapters are extremely beautiful. He was conscious of his poetical genius and of the mastery of language. He writes :—

'माझा मऱ्हाटाचि बोल कौतुकें । परी अमृतातेंही पैजेसी जिंके ।
ऐसीं अक्षरेंचि रसिकें । मेळवीन' ॥

'Though my expressions are in Marathi yet I shall make the learned say that these words are sweeter than nectar.'

At the first glance one is tempted to think that there is sufficient reason to accuse the poet of his boast. But if he would

# A MARATHA SAINT AND POET

IN this article an attempt is made to write a few words on Dnaneshwar, the first great Maratha poet well-known for his book *Dnaneshwari*. But before discussing the actual merits and demerits of this composition we should know the life of the poet. And it is why an outline history of his life is given.

He was born in a village accountant's family in Alandi near Poona in the year of Shaka Era 1197. His father's name was Vithal Pant, who in his youth, without the consent of his wife, became a religious mendicant (Sanyasi). But when his preceptor Ramananda of Kashi came to know this by Rakamabai, Vithal Pant's wife, he ordered him to lead a conjugal life again. Afterwards he had four children of whom, Dnaneshwar, our hero, was the second child. The Brahmans declared them outcastes, but when these children showed an extraordinary merit at an early age they were admitted into the caste and their thread-ceremony was performed.

He poured out all his genius in three great books, the *Dnaneshwari*, the *Amrutanabhava* and the *Pansashti*. Many miscellaneous charming poems containing knowledge, devotion and renunciation are also attributed to him. He died 1218 S.

The name which the poet originally ascribed to his first and great book is *Bhavartha Dipika* (a guide to the *Bhagawadgita*). But it is termed as the *Dnaneshwari*, after the poet himself, or because it shows a path to knowledge and God.

It would not be fair on our part to discuss this book according to the different views which are now adopted to form an opinion about any modern poet. At the time when the poet took up his pen it was strongly believed in literary circles that Sanskrit was the only language fit for literary purposes. All the great men of that age adopted Sanskrit as their medium. But this language was beyond the reach of the common folk, so he, with firm mind, made a bold attempt to give expression to his thoughts in Marathi,

# A NEW INFINITY

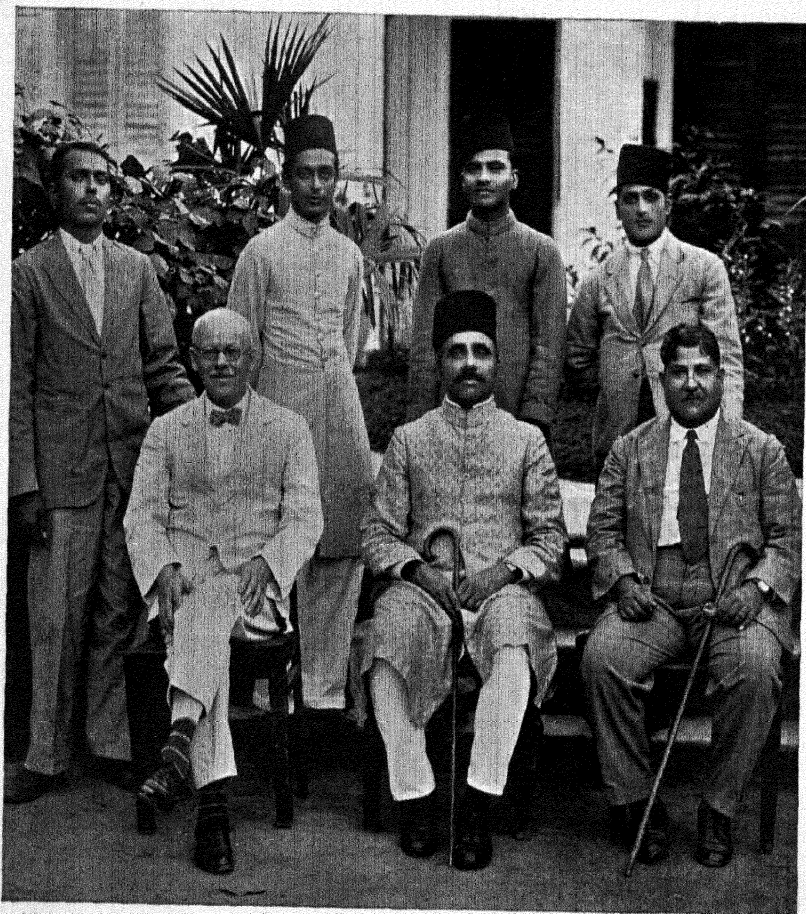
A little wood-path I climbed and climbed
Mile on July mile.
It slipped between the whispering grass
And crossed a twinkling stream.
I followed it, for peace was there;
The brotherhood of stone and tree
Of flower and cloud companioned me
On silent feet.
I reached a wind-sweet summit,
A July world beneath my feet,
My head against the July sky—
I lay upon the downy bed
And saw the tarnished petals of each flower yearn
Towards sky and sun, flaunting their pink and gold—
I gently pushed the delicate leaves apart.
Soon exultation flowed through me
And I felt a new infinity pulsating in the flowers' heart.

SHER MOHAMMAD KHAN,
I YEAR,
*Osmania University College.*

# CONTENTS

## *Vol. V, No. 3.*

# Osmania Magazine Committee
## 1932
## O. U. COLLEGE



STANDING: B. N. Chobe (*Editor, English Sect.*); S. M. Murtuza (*Editor, Urdu Sect.*); A. A. Hai (*Hon. Manager*); Aga Jafar Hasan (*President, Union Society*).

SITTING: Prof. E. E. Speight (*Adviser, Eng. Sect.*); Principal Abdur-Rahman Khan (*President*); Prof. W. Rehman (*Hon. Treasurer*).

# The Osmania Magazine

Being the Journal of the Students

of

The Osmania University College,

Hyderabad - Deccan.

*Editor*

B. N. CHOBE, B. A.

Vol. V. December 1931—March 1932 Nos. 3 & 4.

TITLE PAGE PRINTED AT
THE HYDERABAD PRINTING WORKS
HYDERABAD
DECCAN
1932.

# THE OSMANIA MAGAZINE

**Vol. V.** **December 1931, March 1932** **Nos. 3 & 4**

---



---

*Subscription Price (Annual)*

| | Rs. |
|---|---|
| Government ... ... ... | 12 |
| Universities, other Institutions and State Officials ... ... | 8 |
| General Subscribers ... ... | 6 |
| Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms ... ... ... | 5 |
| Present Students, O. U. C. ... ... | 4 |
| Abroad ... ... ... | Fifteen Shillings |
| Old Students Abroad ... ... | Ten Shillings. |

Single copy Two Rupees.
Registration and V. P. charges extra.

---

*Can be had*

THE MANAGER, OSMANIA UNIVERSITY COLLEGE MAGAZINE,
*Hyderabad - Dn.*

# The Osmania Magazine

Being the Journal of the Students
of
The Osmania University College,
Hyderabad - Deccan.

*Editor*

B. N. CHOBE, B. A.

Vol. V. December 1931—March 1932 Nos. 3 & 4.

TITLE PAGE PRINTED AT
THE HYDERABAD PRINTING WORKS
HYDERABAD
DECCAN
1932.